اردو زبان و ادب کا تحقیقی مجلہ

شمارہ: ۴

جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۶ء

شعبۂ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

تعبیر

اردو زبان و ادب کا تحقیقی مجلہ

شمارہ: ۴

جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۶ء

مدیر

عبدالعزیز ساحر

شعبۂ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

نوٹ: کسی بھی مقالہ نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

نگرانِ طباعت: ڈاکٹر محمد نعیم قریشی، ناظم پی پی یو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

برائے رابطہ: tabeer@aiou.edu.pk

فہرست

اداریہ

(۱)

مخطوطہ نگاری کا فن: ہماری دینی روایت کا امین بھی ہے اور اس کی فکری اور معنوی جمالیات کا ترجمان بھی۔ اس کے اسالیبِ کتابت کتنے ہی رنگوں میں آشکار ہوئے اور کتنے ہی رنگ اس کے اسالیب سے منکشف ہو گئے۔ مخطوطہ نگاری کے لیے کیسے کیسے خط معرضِ اظہار میں آئے اور کیسے کیسے اندازِ کتابت اس فن سے نمود پذیر ہوئے؟ اس کی ترقیم اور ترویج کے لیے کاغذ کی کتنی اقسام منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں اور کن کن علاقوں کی آب و ہوا سے اس کے مشامِ جاں معطر ہوئے۔ روشنائی بنانے میں کن کن چیزوں کے اجزاء باہم مرکب ہوئے اور کن کن طریقوں سے اس کی تحفیظ کا کام لیا گیا۔ اس فن کی رعنائی اور جمالیات کے لیے بھی کتنے ہی لطیف فنون سے اخذ و استفادہ کیا گیا۔ کتنی ہی اصطلاحات اس فن کے اُفق پر طلوع ہوئیں اور اس کے معنوی ابعاد میں رنگ اور نور کی رم جھم ہوتی رہی۔

اقرا باسم ربك الذی خلق کے ابدی اور آفاقی پیغام کی ترقیم اور تحفیظ سے اس فن کی ابتداء ہوئی اور پھر اس کی روشنی اور نور سے ہمارے بام و در مستنیر ہوئے۔ لاکھوں مخطوطے اور قلمی نسخے وجود آشنا ہوئے اور اب بھی دنیا کے ہزاروں کتب خانے ان چراغوں کی لو سے روشن اور تابناک ہیں۔ یہ فن ہمارا دینی اور تہذیبی ورثہ ہے اور اس کے فکری اور جمالیاتی دائرے میں ہماری چودہ صدیاں زندہ و تابندہ ہیں۔

(۲)

مختلف زمانوں میں اس فن کے قلمی آثار اور اظہار پر کیسی کیسی افتاد پڑی؟ ہزار ہا نسخے آتش دیدہ ہوئے اور آب رسیدہ بھی۔ کرمِ کتابی کے لشکر بھی ان ذخائر پر حملہ آور ہوتے رہے اور ان خزائن کی غارت گری میں انھوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ جب چنگیز اور ہلاکو قہر بن کر عالمِ انسانیت پر ٹوٹ پڑے تو لاکھوں لوگ تہ تیغ ہوئے۔ ان المناک حادثوں میں انسانوں کے پہلو بہ پہلو ان علمی خزائن کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ ہزار ہا نسخے دجلہ کی لہروں کی نذر ہوئے۔ اب تک بہت ہی کم قلمی سرمایہ طباعت کی روشنی سے آشنا ہو سکا اور ہنوز قلمی آثار کی صورت میں کتب خانوں کی زینت ہے۔ دنیا بھر میں پھیلے اس قلمی اور خطی سرمائے کی فہارس مختصر اور توضیحی ہر دو صورتوں میں بن چکی ہیں۔۔ ــــــ اور بن رہی ہیں۔ الفہرست اور کشف الظنون سے آغاز ہونے والا یہ سلسلہ اپنی

ارتقائی اور تدریجی منازل کی طرف محوِ سفر ہے۔ اس فن کے ماہرین دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور ہر لمحے اس فن کی نزاکتوں کی ترجمانی میں مگن ہیں۔

(۳)

تعبیر کا چوتھا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ تحقیق کے معیاری اسالیب کے تناظر میں اس کی ترتیب اور تہذیب کا فریضہ انجام دیا جائے۔ اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے؟ اس کا فیصلہ آپ کے ذمے ہے۔ برگِ سبز است تحفۂ درویش کے مصداق یہ ارمغانِ علمی آپ کے حسنِ مطالعہ کی نذر ہے۔

اس شمارے کی ترتیب اور تہذیب میں بھی، حسبِ معمول ہمیں اپنے وائس چانسلر ڈاکٹر شاہد صدیقی کی رہبری اور سرپرستی میسر رہی۔ ہم اس کرم گستری پر ان کے شکرگزار ہیں۔

مدیر

ابرار عبدالسلام
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، سول لائنز، ملتان

آزاد کی حمایت میں

Abrar Abdus Salam
Chairman, department of Urdu,Govt.College,Civil Lines, Multan

Abstract: The unnecessory criticism on Moulana Muhammad Hussain Azad has been denied in this essay in a catagorical way. The essay answers the critiques on *Aab e Hayat* and *Dewan e Zauq* edited by Azad in the light of supporting arguements. The researcher emphasizes that the most of the criticism is based on wrong informations and misconceptions.

شبلی نعمانی جس زمانے میں شعرالعجم لکھ رہے تھے، محمد حسین آزاد کی کتاب سخندانِ فارس شائع ہو کر شبلی کے پاس پہنچی۔ اس کتاب کی نسبت شبلی اپنے ایک دوست کو تحریر فرماتے ہیں:

''آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم وہ اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتا۔'' (۱)

شبلی کی یہ رائے ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ اس نے آزاد کی ساری علمی اور ادبی محنت پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ بعد کے محققین نے بھی آزاد کی آراء کو گپ سمجھتے ہوئے انھیں آڑے ہاتھوں لیا اور ہدفِ تنقیص و تحقیر بھی بنایا۔ کسی نے کہا صرف قصہ کہانیوں پر بنیاد ہے تو کسی نے اس سے بھی تیز نشتر چلایا کہ:

''قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اُڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی نے سامعین کو خوش کیا ہے۔'' (۲)

یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ ہر شخص آزاد کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ پڑا۔ شعرالہند سے آبِ حیات تک چھپنے والی تصانیف اور مضامین میں ایسے ہی جملوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ آزاد کو اتنا طنز و تعریض کا نشانہ بنایا گیا کہ حافظ محمود شیرانی جیسے فاضل محقق کو کہنا پڑا:

''ہمارے عہد کے متشککین نے نہایت سختی سے حضرت مولانا (آزاد) پر نکتہ چینی کی ہے۔'' (۳)

آزاد کو طنز و تعریض کا نشانہ بنانے اور سخت نکتہ چینی کرنے والوں کو اگر شمار میں لایا جائے تو ایک لمبی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ ان معترضین نے آزاد پر لکھتے ہوئے انھیں ناپسندیدہ صفات سے متصف بھی کیا۔ کسی نے اپنی تحریروں میں انھیں دروغ گو کہا تو کسی نے فریبی؛ کسی نے افسانہ طراز کہا تو کسی نے داستان گو؛ کسی نے متعصب کہا تو کسی نے غدار؛ کسی نے جعل ساز کہا تو کسی نے لطیفہ گو؛ کسی نے حکایت ساز کہا تو کسی نے واقعہ تراش اور کسی نے اختراع ساز، غرض طرح طرح

سے آزاد کی تحقیر و تذلیل کی گئی (۴)۔

یہ امر حیرت انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ مخالفتوں کے اس طوفان میں سید مسعود حسن رضوی ادیب جیسے فاضل محقق نے آزاد کی حمایت میں ان الفاظ میں قلم اُٹھایا:

> ''اردو کی پہلی کتاب مؤلفہ مولانا محمد حسین آزاد کا ایک نسخہ جو آپ نے از راہِ عنایت مجھے بھیجا تھا، وصول ہوا۔ آزاد کی علمی، ادبی، تعلیمی خدمات کے اعتراف اور ان کے لیے احسان مندی کے جذبات سے میرا دل لبریز ہے اور ایک مدت سے ان کی ناقدری، بلکہ تحقیر و تذلیل کی جو سازش جاری ہے، اس سے ہر منصف مزاج کو انتہائی تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔ جو شخص کچھ لکھنے بیٹھتا ہے، وہ آزاد کو دو چار صلواتیں ضرور سنا دیتا ہے۔ چند سال ہوئے ایک شخص نے یہاں تک لکھ دیا کہ: 'آزاد ابلیسانہ تلبیس و تدلیس سے کام لیتا ہے۔' اس دریدہ دہنی کو دیکھ کر انصاف کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ میں نے اپنی چھوٹی سی کتاب آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ میں ایک جگہ لکھا: 'بعض ذی علم اور نام بر آوردہ بزرگوں کی غیر تحقیقی تحریروں اور غیر محتاط رایوں سے متاثر ہو کر ایسے نو خیز لکھنے والے، جو علمی استعداد اور معلومات کی وسعت کے اعتبار سے آزاد کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچتے، اس محقق علام کے منہ آنے لگے اور اس پر اعتراض کر کر کے گویا چاند پر خاک ڈالنے لگے۔'' (۵)

یہ اقتباس مسعود حسن رضوی ادیب کے ایک خط سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ خط انھوں نے ڈاکٹر اسلم فرخی کو محمد حسین آزاد کی تصنیف اردو کی پہلی کتاب کے مرتب کرنے پر مبارکباد کے طور پر تحریر کیا تھا۔ اسی خط میں وہ آزاد کی مخالفت میں لکھے جانے والے بیانات پر مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ مستقبل میں آزاد پر مثبت انداز میں کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسی خط سے ان کا ایک اور اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> ''آزاد کے خلاف الزام تراشی اور بدزبانی کی یہ سازش، جو مدت دراز سے جاری ہے، اس کو ختم کرنے اور آزاد کا صحیح مقام معین کرنے کے لیے کسی مناسب تحریک کی شدید ضرورت ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اور ترقیِ اردو بورڈ، جن کے باہمی تعاون سے آزاد کی درسی تصنیفوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، دونوں اردو دنیا کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے اور آزاد کی چھوٹی بڑی تمام تصنیفیں منصفانہ، ہمدردانہ اور عالمانہ مقدموں کے ساتھ اس شان سے نکلیں، جس کی وہ مستحق ہیں۔'' (۶)

مسعود حسن رضوی ادیب نے مذکورہ بالا خط میں اہلِ تحقیق سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ آزاد کی تحریروں پر سخت ہاتھ رکھنے سے پرہیز کریں اور آزاد پر لکھتے ہوئے ہمدردانہ نقطۂ نظر اپنائیں۔ اس کے دو مطلب لیے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ: اہلِ تحقیق آزاد کی تحقیقی فروگذاشتوں اور لغزشوں پر دیدہ دانستہ آنکھیں بند کر لیں اور آزاد کی ہاں میں ہاں ملا دیں اور دوسرا یہ

کہ: آزاد کو ایک انسان سمجھتے ہوئے مذکورہ پہلوؤں پر ہمدردانہ انداز میں تنقید کریں اور تحریروں میں ایسا سخت، مخالفانہ اور جارحانہ انداز نہ اپنائیں، جس سے آزاد کے علمی و ادبی مرتبے کو نقصان پہنچے اور ان کی ادبی شخصیت مجروح ہو کر رہ جائے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کا مطمحِ نظر بھی یہی ہے۔ اس کی واضح دلیل آزاد کی حمایت میں تحریر کی گئی ان کی تصنیف آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ اس تصنیف میں انھوں نے آزاد کے معترضین کو جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''آبِ حیات کے بعض نکتہ چینوں کی کوشش اس پر مرکوز تھی کہ اس تذکرے کو غیر مستند ثابت کریں۔ مسعود صاحب نے آزاد کی مدافعت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔''(۷)

راقم الحروف کا یہ مقالہ بھی مسعود حسن رضوی ادیب کی مذکورہ بالا درخواست اور خواہش کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں آزاد کے حوالے سے بعض ایسے حقائق سامنے لائے جائیں گے، جن کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی کہ آزاد کے حوالے سے کیے جانے والے اعتراضات اور ان پر لگائے جانے والے الزامات میں سے کچھ ایسے بھی ہیں، جو محض غلط فہمی، ناواقفیت، عدم معلومات، کم علمی، یا تحقیقی فروگذاشت کے تناظر میں لگائے گئے۔

محمد حسین آزاد کی تصنیف آبِ حیات اور دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد دو ایسی کتابیں ہیں، جن پر کڑی تنقید کی گئی۔ انھیں دو کتابوں کی اشاعت کے بعد آزاد کی مخالفت میں لکھے جانے کی روایت کا آغاز ہوا۔ ان دو کتابوں نے ایک طرف آزاد کو شہرت سے ہمکنار کیا تو دوسری طرف ان کو معتوبین کی صف میں بھی لا کھڑا کیا۔ لہٰذا اس مقالے میں آزاد کی حمایت میں پیش کیے جانے والے دلائل انھیں دو کتابوں کے حوالے سے پیش کیے جائیں گے۔

آبِ حیات آزاد کی وہ تصنیف ہے، جسے اردو شاعری کی پہلی تاریخ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس تاریخ کی اشاعت نے آزاد کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جلوہ گر کر دیا۔ ایک سو چھتیس سال گزرنے کے باوجود بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی اگر کوئی محقق، یا نقاد اٹھارھویں یا انیسویں صدی بالخصوص شمالی ہند کی ادبی روایت پر قلم اُٹھائے گا تو اسے آبِ حیات کی ورق گردانی ضرور کرنی پڑے گی۔ بیسویں صدی کی شاید ہی کوئی ایسی تصنیف ہو، جس میں انیسویں صدی کی شمالی ہند کی ادبی روایت پر قلم اُٹھایا گیا ہو اور آبِ حیات سے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ اتنی اہم تصنیف ہونے کے باوجود اس کتاب کے بہت سے بیانات پر سخت گرفت کی گئی۔ ان بیانات سے اختلاف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ آزاد کو مطعون بھی کیا گیا۔ اس کتاب میں موجود آزاد کی جن فروگذاشتوں، تسامحات، یا خامیوں پر خامہ فرسائی کی گئی، ان میں سے کچھ ایسی بھی ہیں، جن کا الزام، یا قصور براہِ راست آزاد پر وارد نہیں ہوتا۔ ذیل میں اسی حوالے سے آزاد کے تحریر کردہ چند واقعات، یا بیانات درج کیے گئے ہیں اور ہر بیان، یا واقعہ کے بعد محققین کے اعتراضات نقل

کیے گئے ہیں اور پھر ان اعتراضات کی تردید میں مستند حوالے، ثبوت اور شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

آبِ حیات میں موجود غلطیوں میں سے بعض ایسی ہیں، جن کا الزام براہِ راست آزاد پر لاگو نہیں ہوتا۔ ان غلطیوں کا تعلق براہِ راست آزاد سے نہیں، بلکہ کتابت کی غلطیوں سے ہے۔ جس زمانے میں آبِ حیات کی اشاعت عمل میں آئی، اس زمانے میں کتابوں کے حسنِ اشاعت کا بیشتر دارومدار کاتبوں پر ہوتا تھا۔ اگر کاتب پڑھا لکھا اور ذمہ دار رہوتا تو وہ مسودے کو نقل کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیتا اور کتاب کی خوبصورتی کو دوچند کر دیتا اور اگر کاتب ناخواندہ، یا ناتربیت یافتہ ہوتا تو وہ مسودے کو نقل کرنے میں عجلت پسندی، یا تساہل پسندی کا مظاہرہ کرتا، جس سے کتاب کی خوبصورتی اور متن کا استناد دونوں مجروح ہو جاتے۔ کاتب کے غیر محتاط رویے کا نتیجہ مصنف اور اشاعتی ادارے، دونوں کو بھگتنا پڑتا۔ جب غالب کا دیوان شائع ہو کر ان کے ہاتھوں میں آیا تو اسے دیکھتے ہی غالب سیخ پا ہو گئے، اس لیے کہ دیوان میں متن کی بہت ساری خامیاں راہ پا گئی تھیں۔ اس دیوان کی اشاعت سے متعلق غالب اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"دیوان چھپ چکا ہے۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے، جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا؛ حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر، اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے خانے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا، جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا۔ متوسط، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکا۔ حقِ تصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ ۔۔۔۔ نہ میں خوش ہوا، نہ تم خوش ہو گے اور یہ جو لکھتے ہو، یہاں کچھ خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلال نہیں؛ مہتمم مطبع نہیں۔ مطبعِ احمدی کے مالک محمد حسین خان؛ مہتمم مرزا اموجان مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خان دِلّی شہر، رائے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت چھ [چھے] آنے محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔" (۸)

اس طرح کی صورتِ حال انیسویں صدی کی بہت سی مطبوعات کے حوالے سے پیش آئی۔

انیسویں صدی میں، جن اشاعتی اداروں نے اپنا اعتبار اور افتخار قائم کیا، ان میں ایک نام منشی نولکشور کا بھی ہے۔ اس ادارے کے منتظمین نے کتاب کی ظاہری اور داخلی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے پڑھے لکھے اور ذمہ دار کاتبوں کو ملازم رکھا۔ ان کاتبوں کی کتابت کی جانچ کے لیے بھی ادارے نے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا ہوا تھا۔ اس طرح جب کسی مصنف کی کتاب شائع ہوتی تو اس میں کتابت کی غلطیوں کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے۔

(۱) محمد حسین آزاد کی تصنیف آبِ حیات میں موجود کچھ غلطیوں کا سبب کاتب بھی بنے ہیں۔ آبِ حیات میں آزاد کا بیان ہے:

''شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرے میں ان کی شاعری کی ابتداء میں یہ لکھتے ہیں کہ: ۳محمد شاہی میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی آیا۔'' (۹)

حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون تنقید بر آبِ حیات میں لکھا ہے کہ آزاد سے مصحفی کے تذکرہ ہندی میں ولی کے دیوان کی آمد کی تاریخ لکھنے میں سہو ہوا (۱۰)۔ لیکن جب ہم محمد حسین آزاد کا شاہ حاتم پر لکھا ہوا، وہ مضمون دیکھتے ہیں، جو انھوں نے ستمبر ۱۸۶۷ء میں آبِ حیات کی اشاعت سے ۱۳ سال قبل لکھا تھا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اس مضمون میں انھوں نے ولی کے دیوان کی شمالی ہند آمد کی تاریخ سنہ ۲ محمد شاہی تحریر کی ہے (۱۱)۔ آزاد کے دونوں بیانات کو سامنے رکھنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ولی کے دیوان کی شمالی ہند میں آمد کی تاریخ آزاد نے ۲ محمد شاہی ہی تحریر کی ہوگی۔ مسودہ چونکہ پیشِ نظر نہیں، اس لیے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آزاد نے اپنی سابقہ تحریر کے مطابق آبِ حیات کے متن میں بھی ۲ محمد شاہی تحریر کیا ہوگا اور کاتب نے تساہل برتتے ہوئے، ۲ محمد شاہی کو ۳ محمد شاہی کر دیا ہوگا، جس پر آزاد کی نظر نہیں پڑی ہوگی اور کتاب کی اشاعت کے بعد اسے بھی آزاد کی تحقیقی لغزش پر محمول کیا گیا ہوگا۔ (اس کا بھی امکان ہے کہ آزاد نے حافظے کا سہارا لے کر ۲ محمد شاہی کی بجائے ۳ محمد شاہی لکھ دیا ہو۔) کتابت کی دوسری غلطی درج ذیل واقعے سے ظاہر ہوتی ہے۔

(۲) آزاد نے آبِ حیات میں ناسخ کی کہی ہوئی جرات کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ نقل کیا ہے۔

جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے
گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا:
ہائے ہندستان کا شاعر موا
(۱۲۲۵ھ)(۱۲)

قاضی صاحب کے پیشِ نظر آبِ حیات کا جو نسخہ تھا، اس نسخے میں ناسخ کی تاریخِ وفات کا مادہ ہائے ہندوستان کا شاعر موا مرقوم تھا۔ قاضی صاحب نے لکھا کہ آزاد نے اس پر غور نہیں کیا کہ مصرع سے ۱۲۳۱ھ نکلتے ہیں اور مصرع بھی ناموزوں ہے۔ ناسخ نے ہندوستان بدونِ واؤ لکھا ہوگا، جس سے مصرع بھی موزوں ہو جاتا ہے اور ۱۲۲۵ھ بھی متخرج ہوتا ہے (۱۳)۔ اگر قاضی صاحب کے پاس آبِ حیات کے اولین ایڈیشن ہوتے تو انھیں اصل حقیقت کا علم ہو جاتا کہ یہ کرشمہ آزاد سے نہیں، بلکہ کاتب سے سرزد ہوا ہے۔ کاتب نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندستان بدونِ واؤ لکھا ہوا ہے، اسے صحیح املا کے مطابق ہندوستان بنا دیا۔ مادۂ تاریخ میں و کے اضافے سے چھے سال کا فرق پڑ گیا۔ مزید یہ کہ قاضی صاحب کے پیشِ نظر آبِ حیات کا جو نسخہ تھا، اس میں اگرچہ ہندوستان واؤ کے ساتھ ہی مرقوم ہے، لیکن اس کے

ساتھ ہی ۱۲۲۵ھ بھی تحریر ہے۔ اگر قاضی صاحب ذرا غور کرتے تو وہ اس حقیقت تک بآسانی پہنچ سکتے تھے کہ غلطی دراصل آزاد کی نہیں، بلکہ کاتب کی ہوسکتی ہے، کیونکہ آبِ حیات میں تاریخ کے ساتھ ۱۲۲۵ھ بھی لکھا ہوا تھا، لیکن قاضی صاحب نے اس پر غور کیے بغیر اس غلطی کو بھی آزاد کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ممکن ہے قاضی صاحب نے یہ دیکھتے ہوئے کہ آزاد نے آبِ حیات میں بہت سے مقامات پر غلط مادہ ہائے تاریخ درج کیے ہیں، اس لیے یہ غلط مادۂ تاریخ بھی آزاد ہی نے درج کیا ہوگا۔ اسے بھی آزاد کی تساہل پسندی کا نتیجہ سمجھتے ہوئے آزاد سے منسوب کردیا ہو۔

(۳) محمد حسین آزاد پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر استاد ذوق کے کلام پر جابجا اصلاحیں دی ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے تفصیل سے آزاد کے کلامِ ذوق پر اصلاحوں کے ثبوت پیش کیے ہیں (۱۴)۔ راقم الحروف نے بھی اپنے مقالے آبِ حیات میں آزاد کی اصلاحیں۔ ایک تحقیقی مطالعہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ آزاد نے دیوانِ ذوق ہی میں نہیں، آبِ حیات میں مندرج بہت سے اشعار کے متون میں بھی شعوری طور پر تبدیلیاں کی ہیں (۱۵)۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزاد نے یہ عمل دانستہ کیا تھا۔ ذوق کے کلام میں تبدیلیوں کا مقصد یہ تھا کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد ذوق کے کلام کی زبان پرانی ہوچکی تھی، اسے تبدیل کرکے نئے عہد کے مطابق کردی جائے، تاکہ آزاد کے عہد کے پڑھنے والوں کو ذوق کا کلام سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے، لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا اس طرح کا عمل صرف آزاد سے ہی سرزد ہوا ہے اور کیا آزاد کے معاصرین، یا ان سے قبل کے شعراء، یا ادباء نے اپنے اساتذہ کے کلام پر اس طرح کی اصلاحیں نہیں دیں؟ اس کا جواب اردو کی ادبی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے سے بخوبی حاصل ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کا طرزِ عمل کئی شعراء کے ساتھ ان کے شاگرد شعراء، یا مرتبین نے کیا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اس طرح کی کئی مثالیں سامنے آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر گارساں دتاسی نے دیوانِ ولی کے ایک ایڈیشن کے بارے میں نشاندہی کی ہے کہ وہ حال ہی میں بمبئی سے شائع ہوا ہے اور اس میں حسبِ ضرورت متن میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ (۱۶)

اسی طرح رشک نے بھی اپنے استاد شیخ امام بخش ناسخ کے دیوان اور ان کی مثنوی سراجِ نظم کو مرتب کرتے ہوئے اسے جابجا اصلاحوں کی کٹھالی سے گزارا (۱۷)۔ اس طرح کی تیسری مثال مصحفی کے کلام کی پیش کی جاسکتی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں رامپور سے مصحفی کے کلام کا انتخاب شائع ہوا۔ اس کے مرتبین مظفر علی اسیر اور ان کے شاگرد امیر مینائی تھے۔ مصحفی کے کلام کا یہ انتخاب والیِ رامپور نواب کلب علی خان کی فرمائش پر تیار کیا گیا۔ یہ انتخاب پہلی مرتبہ تاج المطابع، رامپور سے اور دوسری مرتبہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوا۔ مصحفی کے کلام کے انتخاب کرنے کے

لیے مرتبین نے مصحفی کے کلام میں موجود متروک الفاظ کو ان کے کلام سے نکال دیا اور ان کی جگہ وہ نئے الفاظ، جو ان کے عہد میں مستعمل تھے، شامل کر دیے۔ مرتبین نے مصحفی کے کلام میں اس طرح تصحیح کی کہ اشعار کا وزن بھی برقرار رہے اور مصرعے بھی زبانِ حال کے مطابق ہو جائیں۔ مرتبین کے اس عمل کی نشان دہی سب سے پہلے مولوی عبدالسلام رامپوری نے کی ہے۔ عبدالسلام رامپوری نے ایسے ۵۶ اشعار کی نشاندہی کی ہے، جن میں اسیر اور امیر مینائی نے معنوی رلفظی رلسانی رلغوی اصلاحیں کیں۔ انھوں نے کلیاتِ مصحفی جلد دوم مملوکہ رضا لائبریری رامپور سے ان اصلاحوں کے ثبوت فراہم کیے۔ محمد بدرالدین کی تحقیق یہ ہے کہ اسیر اور امیر مینائی نے مصحفی کے کلام کا انتخاب کرتے ہوئے مصحفی کے پہلے، دوسرے، تیسرے، چوتھے اور ساتویں دیوان کو پیشِ نظر رکھا اور ان پانچوں دواوین سے مصحفی کے کلام کا انتخاب بھی کیا اور ان کے منتخب کردہ کلام پر اصلاحیں بھی دیں (۱۸)۔

مذکورہ بالا تینوں مثالوں میں مصنف کے کلام میں تبدیلیوں کا محرک صرف اور صرف یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کی زبان اور مابعد عہد کی زبان میں جو تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، انھیں زبانِ حال کے مطابق کر دیا جائے، تاکہ ان کے عہد کے قارئین کے لیے، ان کا کلام قابلِ فہم بھی ہو اور پڑھتے ہوئے قدیم بھی نہ لگے۔ جدید لسانیات رمتنی ناقدین نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ متن کو اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ منشائے مصنف میں تحریف نہ ہونے پائے۔ متنی تبدیلیوں، یا تحریفات کی صورت میں متن کی اصل حالت برقرار نہیں رہتی، اس لیے جب متنی ناقد، یا مؤرخ متن کی تحریفی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلے کرنے، یا نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا یہ طرزِ عمل اندھیرے میں نشانہ لگانے، یا ٹامک ٹوئیوں کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ وہ زبان میں رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں کو صحیح طور پر سمجھنے میں ناکام رہے گا۔ جدید دور میں متنی تنقید کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی بھی زبان کے لسانی ارتقا کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے اصل متن کی بازیافت ضروری ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے شعراء کے کلام کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے خسرو کا ہندوی کلام کے نام سے خسرو سے منسوب اردو کلام شائع کیا ہے۔ خسرو کے اردو کلام اور اس کے متن کے حوالے سے محققین نے جو اعتراضات کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کتاب میں خسرو سے جو اردو کلام منسوب کیا گیا ہے، اس کی زبان و بیان چھ سو سالہ قدیم نہیں لگتی۔ بالفرض یہ کلام خسرو کا بھی ہو، تب بھی اس کی یہ صورت نہیں ہو سکتی، جو خسرو سے منسوب ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خسرو کا ہندوی کلام کتنی زبانوں کے سرچشموں سے سیراب ہوا ہوگا، اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکتی (۱۹)۔

آزاد کے عہد تک منشائے مصنف میں تبدیلی کو غالباً معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب محمد حسین آزاد

اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق کا کلام مرتب کرتے ہیں تو ان کے کلام میں متروکات کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنے عہد کے مستعمل نئے لفظوں سے بدل دیتے ہیں۔ جدید تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ آزاد کا جرم بنتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کے کلام میں تبدیلیاں کر کے ادبی خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ (اس عمل کو بددیانتی سے تعبیر کیا بھی جائے تو بے جا نہیں)، لیکن جس زمانے میں یہ تبدیلیاں کی گئی ہیں، اس زمانے میں غالباً اسے ناقابلِ معافی جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ آزاد نے ذوق کے کلام کو مرتب کرتے ہوئے جس سلیقے کا مظاہرہ کیا اور عرق ریزی سے کام لیا، اس نہج پر ان کے عہد میں شاید ہی کوئی دیوان مرتب ہوا ہو۔ دیوانِ ذوق کو مرتب کرتے ہوئے آزاد نے جدید متنی اصولوں کا استعمال کیا۔ یہ اصول آزاد کے وضع کردہ تھے۔ یہی اصول بعد کے عہد میں شاعری کو مرتب کرنے کے اصول قرار پائے۔

قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی نے آبِ حیات میں موجود آزاد کی بعض ایسی تحقیقی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے جن کا الزام براہِ راست آزاد پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ ان کا الزام بھی ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے، جنھوں نے آزاد کو ادھوری، نامکمل، یا غلط معلومات فراہم کیں۔ انھوں نے آزاد کو معلومات فراہم کرتے ہوئے تحقیق سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنی یادداشت، یا اپنے نقطۂ نظر کے مطابق معلومات فراہم کر دیں۔ انھیں معلومات کو آزاد نے اکثر اوقات بعینہٖ اور بعض اوقات جزوی تبدیلیوں کے بعد آبِ حیات کا حصہ بنا دیا۔ اس طرح کی غلطیاں منشی ذکاء اللہ اور علاء الدین احمد خان علائی کے خطوط میں دیکھی جا سکتی ہیں، مثلاً:

(۴) آبِ حیات کی عبارت ہے:

''نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ جھجھر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔'' (۲۰)

آبِ حیات کی اس عبارت میں موجود شعر پر کالی داس گپتا رضا نے اعتراض کیا:

''یہ شعر آزاد کا من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ اصل شعر جس کا ذکر خود غالب نے اردوئے معلّٰی میں کیا ہے، وہ میر امان اسد شاگردِ سودا کا ہے اور اس شعر سے قدرے مختلف ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش! رحمت خدا کی (۲۱)

کالی داس گپتا رضا کے اعتراض پر کاظم علی خان لکھتے ہیں کہ کالی داس گپتا رضا جس شعر کو آزاد کا من گھڑت قیاس

فرماتے ہیں، وہ آزاد کو شاگردِ غالب نواب علاء الدین احمد خان علائی نے اپنے خط کے ذریعے فراہم کیا تھا۔۔۔اس غلط روایت کا اندراج آبِ حیات کی فروگذاشت ضرور ہے، لیکن اس غلطی کی ذمے داری آزاد سے زیادہ (شاگردِ غالب) علائی پر عائد ہوتی ہے(۲۲)۔

ذیل میں علاء الدین احمد خان علائی کے خط سے وہ اقتباس درج کیا جاتا ہے، جس سے آزاد نے معلومات حاصل کیں اور آبِ حیات میں تحریر کیں۔علائی کے مذکورہ خط کا مطلوبہ اقتباس درج ذیل ہے:

''آپ کا سوال نسبت تبدیلِ تخلص: جواب مجھ کو یاد ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ء، یا ۱۸۲۹ء کے قریب انھوں نے تخلص تبدیل کیا اور واقعی اسد اللہ خاں کے نام کے واسطے غالب ہی تخلص زیبا تھا، کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ لقب قرار دیا گیا تھا۔دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ بونگا، کوڑھبا، جھجر کا شعر کہتا تھا، اس کے ایک مقطع میں لفظ اسد ان کی نظر سے گزرا اور وہ مقطع یہ ہے:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر! رحمت ہے خدا کی

ہم تخلص ہونا جناب مرحوم کو ایسے لوگوں سے، جو تہمت آدم ہیں، نہایت مکروہ معلوم ہوا۔اس وجہ سے اسد اللہ خاں کے ساتھ لفظ غالب کو موضوع کر دیا۔(۲۳)

(۵) آزاد کا بیان ہے:

''ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔چنانچہ ۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔''(۲۴)

کالی داس گپتا رضا نے آزاد کی اس روایت کو بھی غلط قرار دیا۔ان کا بیان ہے:

''غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں بنوائیں۔پہلی پر اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ کندہ کرایا اور دوسری پر (جو بعد میں بنوائی گئی) اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ۔ ۱۲۳۱ھ مطابق ہے ۱۶۔۱۸۱۵ء کے۔دوسری مہر حقیقت میں حضرت علیؓ کا لقب ہے اور عبارت بطور سجع ہے۔بعد میں تبدیلِ تخلص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار پایا۔۱۸۱۶ء میں غالب تخلص کا استعمال باقاعدگی سے کرنے لگے۔''(۲۵)

کالی داس گپتا رضا کا اعتراض درست ہے، مگر آبِ حیات میں اس غلط سنہ کا اندراج بھی علائی کے مذکورہ بالا خط کی اطلاع پر مبنی ہے۔

آزاد کا بیان ہے:

''تصنیفاتِ اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔''(۲۶)

کالی داس گپتا رضا نے نشاندہی کی کہ غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار چھپا۔

پہلی بار: مطبع سید الاخبار دلّی سے، اکتوبر ۱۸۴۱ء میں، اس میں ۱۰۹۶ شعر ہیں۔

دوسری بار: دار السلام دلّی سے، مئی ۱۸۴۷ء میں، اس میں ۱۱۵۸ شعر ہیں۔

تیسری بار: احمدی دلّی سے، جولائی ۱۸۶۱ء میں، اس میں ۱۷۹۶ شعر ہیں۔

چوتھی بار: مطبع نظامی کانپور سے، جون رجولائی ۱۸۶۲ء میں، اس میں ۱۸۰۲ شعر ہیں۔

پانچویں بار: مفید خلائق آگرہ سے، ۱۸۶۳ء میں، اس میں ۱۷۹۵ شعر ہیں (۲۷)۔

کالی داس گپتا رضا کا بیان درست ہے لیکن آبِ حیات کے اس تسامح کی بنیاد بھی آزاد کے نام علائی کا خط بنا ہے۔

علائی کا بیان ہے:

''پانچواں سوال: کتب مصنفہ کی تدوین۔ جواب: دیوانِ فارسی ۱۸۳۳ء، ۱۸۳۵ء میں ترتیب دیا گیا۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں، وہ الواحِ طبع سے مل سکتا ہے۔ دیوانِ اردو ۱۸۴۹ء کے بعد ترتیب پذیر ہوا۔(۲۸)

آبِ حیات میں موجود بعض غلطیوں کا سبب خود غالب بھی بنے ہیں۔ غالب کی عادت تھی کہ وہ مختلف واقعات کے بیان کرنے میں محتاط طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض مقامات پر تو انھوں نے اشعار کے متن کے اندراج میں بھی غلطی کا مظاہرہ کیا ہے۔ غالب سے نادانستہ ہونے والی یہی اغلاط ان کے خطوط کے توسط سے آبِ حیات میں جگہ پا گئیں، جس کا خمیازہ ناکردہ گناہوں کی صورت میں آزاد کو بھگتنا پڑا۔ مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(۶) آبِ حیات میں ہے کہ غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کچھ عرصے تک حیدرآباد دکن میں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے تھے (۲۹)۔ کالی داس گپتا رضا نے آزاد کے اس بیان کو غلط قرار دیا۔

ان کا بیان ہے:

''یہ درست نہیں، نواب نظام علی خان کے منصب داروں کی فہرست میں ان (غالب کے والد) کا نام نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدرآباد میں بہت معمولی حیثیت سے کار گزار رہے ہوں گے (۳۰)، یعنی تین سو یا چار سو کی جمعیت کے رسالدار نہ ہوں گے۔'' (۳۱)

کاظم علی خاں نے نشاندہی کی ہے کہ آزاد نے غالب کے والد کی حیدرآباد میں تین سو سوار کی رسالہ داری کی روایت خود غالب کے اس خط کی بنیاد پر بیان کی ہے، جو انھوں نے منشی حبیب اللہ ذکا کو تحریر کیا۔ یہ خط جمعہ ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو لکھا گیا اور اردوئے معلّی حصہ اول میں موجود ہے۔ ان حالات میں اگر یہ روایت بھی غلط ثابت ہوئی تو اس کی ذمے داری محمد حسین آزاد کے بجائے خود غالب پر آئے گی (۳۲)۔

حبیب اللہ ذکاء کے نام غالب کے خط کی مطلوبہ عبارت درج ذیل ہے:

''باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔'' (۳۳)

(۷) اسی طرح آزاد کا بیان ہے:

''نواب احمد بخش خان بہادر کی تقسیم سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے''۔ (۳۴)

کالی داس گپتا رضا نے آزاد کے اس بیان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

''غالب ۲۱ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت پور) میں گروتالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔'' (۳۵)

کاظم علی خان کا بیان ہے کہ کالی داس گپتا رضا نے آزاد کے بیان پر صحیح گرفت کی ہے، لیکن آبِ حیات کی یہ روایت بھی خود غالب کے محولہ بالا خط بنام حبیب اللہ ذکاء پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود غالب سے اپنے سفرِ کلکتہ کا سنہ لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ (۳۶)

حبیب اللہ ذکاء کے نام غالب کے خط کی مطلوبہ عبارت درج ذیل ہے:

''۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ سر پیچ مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔'' (۳۷)

(۸) آبِ حیات میں آزاد نے لکھا ہے:

''ساطعِ برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں، وہ بھی مرزا صاحب (یعنی غالب) کے ہیں۔'' (۳۸)

آزاد کے اس قول سے قاضی عبدالودود نے صحیح اختلاف کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں قاضی عبدالودود نے یہ دعویٰ بھی فرمایا ہے کہ غالب کی قاطعِ برہان کی مخالفت، یا موافقت میں لکھی جانے والی کسی کتاب میں سید عبداللہ کا نام تک نہیں آیا ہے۔ غالب کی قاطعِ برہان کی مخالفت میں ۱۸۸۶ء میں شائع ہونے والی مولوی احمد علی کی کتاب شمشیرِ تیز تر کے سرورق کی فارسی عبارت بتاتی ہے کہ شمشیرِ تیز تر مولوی غلام نبی کے مطبعِ نبوی میں بسعی و کوشش عبداللہ خاں چھپی تھی، جس سے قاضی صاحب کے مذکورہ دعوے کی نفی ہوتی ہے۔ (۳۹)

(۹) مولانا محمد حسین آزاد نے بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل، جس کا مطلع اور مقطع ہے:

مزا چکھایا ہے کوہکن کو، جو عشق آیا ہے امتحاں پر
کہ لایا تو جوئے شیر، لیکن چھٹی کا دودھ آ گیا زباں پر

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آتی
جو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی، ہمارے داغِ دلِ طپاں پر

کے حوالے سے لکھا:

''جب بادشاہ کا دیوان چھپ کر آیا تو مجھے یاد ہے کہ والد مرحوم (مولوی محمد باقر) نے غزل مرقوم الذیل کو دیکھ کر مجھے کہا: 'یہ غزل بھی بادشاہ کو دے دی، لڑکپن کی ہے۔ والد کو پہلے سے ساری یاد تھی۔'' (۴۰)

آزاد کی اس عبارت پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

''اس طرح کی روایتوں پر اعتماد کرنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اس غزل کے دو شعر بیاضِ عوض علی مخزونہ رضا لائبریری رامپور میں، جو ۱۲۶۸ھ کی مرتبہ ہے، ذوق کے نام سے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک شعر ہے:

اٹھائے سو زخم ہر نمط ہیں یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثل قحط گیر خط پہ خط ہیں، ہنوز باقی ہر استخواں پر

یہ دوسرا شعر مولانا امام بخش صہبائی نے رسالہ قواعدِ صرف ونحو میں دو مرتبہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے: 'شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کا شعر ہے۔'' (۴۱)

(۱۰) محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ایک روایت بیان کی ہے:

''ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انھیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا:

سودا کی جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے'' (۴۲)

میر کی آہ اور سودا کی واہ والی روایت کی صحت کو ڈاکٹر خلیق انجم مشکوک قرار دیتے ہیں (۴۳)۔

امیر مینائی کے ایک شاگرد ممتاز علی آہ نے اپنی تصنیف امیر مینائی میں ایک شعر درج کیا ہے، جو مذکورہ بالا اعتراض کو رد کرتا ہوا نظر آتا ہے:

سودا و میر دونوں تھے کامل، مگر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں (۴۴)

آبِ حیات کی پہلی اشاعت ۱۸۸۰ء کے ساتھ ہی آزاد پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انھیں مختلف حوالوں سے مطعون کیا جانے لگا۔ ان اعتراضات کا مداوا کرنے کے لیے آزاد نے آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں بہت سی ترامیم و اضافوں کے بعد اسے دوبارہ ۱۸۸۳ء میں شائع کروا دیا۔ آبِ حیات کا تیسرا ایڈیشن لاہور ہی سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں بھی آزاد نے بعض اضافے کیے ہیں۔ یہ ایسے اضافے ہیں، جن کی راقم الحروف سے پہلے کسی نے نشاندہی نہیں کی۔ یہ اضافے ایک خاص انداز میں کیے گئے ہیں۔ ان اضافوں سے متعلق آزاد کا کوئی بیان اور نہ کوئی خارجی شہادت موجود ہے۔ مزید یہ کہ آبِ حیات کے تیسرے ایڈیشن کا پیٹرن اور صفحات کی تعداد بعینہٖ دوسرے ایڈیشن کے مطابق رکھی گئی ہے، اس لیے ان اضافوں پر کسی محقق کی نگاہِ تحقیق نہ پڑ سکی۔ اس ضمن میں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ اس ایڈیشن میں آزاد نے جو تبدیلیاں کی ہیں، ان میں ایک تبدیلی ایسی ہے، جس کی وجہ سے غلط فہمی نے بھی جنم لیا اور آزاد اور آزاد کے اہلِ خانہ کو مطعون بھی کیا گیا۔

(۱۱) آبِ حیات کے دوسرے ایڈیشن میں آزاد نے آتش و ناسخ کے یہ دو شعر نقل کیے:

سرمہ منظورِ نظر ٹھیرا جو چشمِ یار میں
نیلگوں گنڈا پنھایا مردمِ بیمار میں

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشمِ یار میں
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار میں

اور ان پر اعتراض کیا کہ ان اشعار میں میں کی بجائے پر ہونا چاہیے۔(۴۵)

آزاد کے اس اعتراض پر قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

''اس زمین میں آتش و ناسخ نے بکثرت اشعار کہے ہیں اور ان کے مطبوعہ کلیات میں ردیف کو ہی ہے۔ دیوان کی طرف رجوع کیے بغیر، اعتراض جڑ دینا غیر ذمہ دارانہ روش ہے''(۴۶)

قاضی صاحب کے اس اعتراض پر رشید حسن خاں نے نشاندہی کی کہ قاضی صاحب کے پاس آبِ حیات کا ۱۹۱۷ء کا نسخہ تھا، اس میں ردیف میں موجود ہے۔ میرے پاس ۱۸۹۹ء کا نسخہ ہے جس میں ردیف کو ہی ہے، لیکن آگے چل کر وہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان بھی دے دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''آبِ حیات بارہا چھپی ہے اور اس کی مختلف اشاعتوں میں اختلافات پائے جاتے ہیں، مگر خاص بات یہ ہے کہ جو اشاعتیں ۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہیں، ان میں اور بعد کی اشاعتوں میں زیادہ اختلافات ہیں۔ آزاد کی دیوانگی کا زمانہ بھی معلوم اور یہ کہ ان کے ورثا بھی صاحبِ قلم تھے۔''(۴۷)

رشید حسن خاں کے خیال میں آبِ حیات کے متون میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کا ایک بڑا محرک آزاد کے اہلِ

خانہ بھی تھے۔ بغیر ثبوت کے اس قسم کا بیان لکھنا مناسب نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آبِ حیات کے مذکورہ شعر میں تبدیلی ان کے اہلِ خانہ نے نہیں، بلکہ خود آزاد نے کی تھی۔ اس کی شہادت آبِ حیات کے تیسرے ایڈیشن ۱۸۸۷ء سے حاصل ہوتی ہے۔ اس ایڈیشن میں آزاد نے جو تبدیلیاں کیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آزاد نے ان اشعار میں ردیف میں کی بجائے کو کر دی۔ رشید حسن خاں اس تبدیلی سے لاعلم تھے۔ اس لاعلمی کی بنا پر انھوں نے مذکورہ بالا موقف اختیار کیا۔ آزاد کی خود کردہ تبدیلیوں کے علاوہ، جو متنی تبدیلیاں آبِ حیات میں نظر آتی ہیں، اُن کے ذمہ دار آزاد کے اہلِ خانہ نہیں، بلکہ کاتب ہیں۔ اس بات کے شواہد ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۰ء کے ایڈیشن سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر آزاد کے اہلِ خانہ میں سے کوئی شخص کسی قسم کی متنی تبدیلی کرتا تو وہ ۱۸۹۰ء کے بعد کے ایڈیشن میں کر سکتا تھا، کیونکہ آزاد کا دورِ جنون ۹۰-۱۸۸۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ (۴۸)

(۱۲) آزاد نے آبِ حیات میں میر کی زبانی یہ واقعہ تحریر کیا ہے:

''لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت! آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا: ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار اور کچھ تأمل کر کے کہا: آدھے خواجہ میر درد''۔ (۴۹)

ایک اور مقام پر لکھا:

''میر نے انھیں آدھا شاعر شمار کیا ہے۔'' (۵۰)

آزاد کے ان بیانات پر سید اعجاز احمد سہسوانی نے یہ موقف اختیار کیا کہ آزاد کا آبِ حیات میں درد کو آدھا شاعر لکھنا محض افترا ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ (۵۱) احتشام حسین نے بھی اس واقعے کو مشکوک قرار دیا ہے۔ (۵۲) سید اعجاز احمد کا اعتراض اور احتشام حسین کا قیاس درست نہیں۔ میر کے عہد میں ڈھائی شاعر کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ اس کی تصدیق مصحفی کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

درد کو شاعروں میں سمجھوں میں
یہ تو ہونا نہیں ہے وا در وا
کیونکہ دلّی کے بیچ گزرے ہیں
ڈھائی شاعر سر آمدِ شعرا
اس کی تفصیل یہ کہ کہتے ہیں:
میر و مرزا دو اور درد آدھا (۵۳)

(۱۳) آزاد نے میر تقی میر سے متعلق آبِ حیات میں یہ واقعہ درج کیا ہے:

''لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا کہ مسافروں کا دستور ہے ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ

مشاعرہ ہے، رہ نہ سکے۔ اُسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہ کیا ہوا اُس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائینچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع۔ انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن، زمانہ کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا، بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفوِ تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدّولہ مرحوم نے سنا اور دوسو (۲۰۰) روپیہ مہینا کر دیا۔" (۵۴)

قاضی عبدالودود نے آزاد کے بیان کردہ اس واقعے کو میر سے منسوب کیے جانے پر اعتراض کیا تھا۔ ان کا بیان ہے:

"آبِ حیات ص ۲۰۵ میں بے سروسامانی کے عالم میں عازمِ لکھنؤ ہونے، گاڑی میں زبان کے بگڑ جانے کے متعلق گفتگو، مشاعرے میں شرکت یہ سب مصنوعی ہیں۔ میر، آصف الدولہ کے بلائے ہوئے گئے تھے اور اخراجاتِ سفر انھیں پیشگی مل گئے تھے۔ قطعہ بھی جو ص ۲۰۶ میں میر کی طرف منسوب ہے نہ کلیاتِ میر میں ہے اور نہ کسی اور کتاب میں۔" (۵۵)

۱۹۶۳ء میں نثار احمد فاروقی کو انجمنِ محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں ایک قدیم قلمی بیاض ملی۔ اس بیاض سے قاضی صاحب کے مذکورہ بالا دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اس بیاض پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"یہ بیاض بطورِ کشکول ترتیب دی گئی ہے اور اسی میں میر کی مثنوی خواب وخیال بھی درج ہے۔ اس کے ترقیمے میں اوّل رجب ۱۲۱۶ھ روز چہار شنبہ لکھا ہے، گویا یہ بیاض میر کی زندگی میں جمع ہوئی ہے۔ اس میں

یہ اشعار بہ تبدیلِ الفاظ میر سے منسوب کیے گئے ہیں:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم آہ
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

ان اشعار کی یہ آبِ حیات سے قدیم تر سند پہلی بار دریافت ہوئی ہے اور اس کی روشنی میں ان کا تصنیفِ میر ہونا قبول کیا جا سکتا ہے (۵۶)

(۱۴) آزاد نے آبِ حیات میں ولی کے سلسلے میں لکھا ہے ''غرض جب ان کا دیوان دلّی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا؛ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا؛ لذت نے زبان سے پڑھا؛ گیت موقوف ہو گئے؛ قوال معرفت کی محفلوں میں انھی کی غزلیں گانے بجانے لگے؛ اربابِ نشاط یاروں کو سنانے لگے۔(۵۷) آزاد کے مذکورہ بیان کے حوالے سے قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ یہ سب الہامی باتیں ہیں اور ان کا ثبوت موجود نہیں۔ ان کے خیال میں گیت موقوف ہو گئے، خاص طور پر قابلِ توجہ ہے (۵۸)۔ قاضی صاحب کا یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ راقم السطور کے خیال میں امکان غالب یہ ہے کہ آزاد نے مصحفی، یا قتیل کے درج ذیل بیانات کے پیشِ نظر مذکورہ بالا عبارت تحریر کی ہوگی۔ مصحفی کا بیان ہے:

''روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ درسن دویم فردوس آرامگاہ، دیوانِ ولی در شاھجہاں آباد آمدہ واشعارش برزبان خرد و بزرگ جاری گشتہ باد۔''(۵۹)

اور مرزا قتیل کا بیان ہے:

''فرقہ کا یتھ ... در عالم مستی شراب همراه تقلید اشعار فارسی و عباراتِ گلستان و ریختہ ولی دکھنی رارسوامی کندو در مجلس یك دیگر علم موسیقی رانیز باوجود عنایت سازند و خود در حالت بے خودی صورت خود را پسندیدہ برقص در آیند۔''(۶۰)

دونوں بیانات ایسے ہیں جن کے حوالے سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں بیانات آزاد کے پیشِ نظر رہے ہوں گے اور انھیں بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے آزاد نے مذکورہ عبارت تحریر کی ہوگی۔ ہر دو صورت

میں قاضی صاحب کا اعتراض مکمل طور پر درست ثابت نہیں ہوتا۔

(۱۵) آزاد نے آبِ حیات میں میر سوز کے حالات میں مندرجہ ذیل قطعہ کو میر سوز سے منسوب کیا ہے:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے(۶۱)

اس سلسلے میں قاضی عبدالودود کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قطعہ سوز کا نہیں، بلکہ ظہور دہلوی کا ہے اور دیوانِ ظہور ص ۱۰۵ میں بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے اور اس کی اصلی شکل یہ ہے:

گیا میں اتفاقاً کل سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں بیٹھی ہوئی تھی ان کی بھینگی
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے(۶۲)

دیوانِ ظہور میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ ۱۳۰۰ھ میں میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ مذکورہ بالا قطعہ دیوانِ ظہور کے ص ۱۰۵ کے حاشیے میں ظرافت کے عنوان کے تحت اسی طرح درج ہے، جیسا کہ قاضی صاحب نے نشاندہی کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قطعہ ظہور کے دیوان میں ہونے کے باوجود ان کا نہیں۔ یہ قطعہ دراصل انشاءاللہ خان انشاء کا ہے۔ مبتلا میرٹھی نے طبقاتِ سخن میں اسے انشاء سے منسوب کیا ہے اور اس کی مندرجہ ذیل صورت درج کی ہے:

گئے کل اتفاقاً ہم سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھا جو اک کافر کو بیٹھا
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے(۶۳)

دیوانِ ظہور میں ظہور دہلوی کا تاریخی نام 'ظہور علی' مرقوم ہے، جس سے (۱۱۱۱+۱۱۰) ۱۲۲۱ھ متخرج ہوتے ہیں۔ یہی ظہور دہلوی کی تاریخِ پیدائش ہے۔ طبقاتِ سخن بھی تاریخی نام ہے، اس سے (۵۱۲+۷۱۰) ۱۲۲۲ھ برآمد ہوتے ہیں، جس سے طبقاتِ سخن کے سالِ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے۔ مذکورہ دونوں تاریخی ناموں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ظہور دہلوی کی پیدائش کے ایک سال بعد جو تذکرہ (طبقاتِ سخن) مرتب ہوا، اس میں یہ قطعہ موجود ہے۔

طبقاتِ سخن میں اس قطعہ کی موجودگی قاضی صاحب کے بیان کی تردید کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا قطعے کی دیوانِ ظہور میں موجودگی کے باجود یہ قطعہ ظہور کا نہیں ہوسکتا۔ چونکہ ظہور دہلوی کے آغازِ شاعری سے پہلے ہی یہ قطعہ انشاء سے منسوب ہے، اس لیے اسے ظہور کا نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے ظہور نے اس قطعہ پر گرہ لگائی ہو اور بعد میں جب دیوانِ ظہور مرتب ہوا ہو تو اسے بھی دیوانِ ظہور میں شامل کردیا گیا ہو۔ زمانۂ قدیم میں بہت سا ایسا کلام جو صاحبِ دیوان کا نہیں ہوتا تھا، وہ بھی اس کے دیوان میں شامل ہوجاتا تھا۔ شاگرد شعراء کا بہت سادہ کلام جو استاد شاعر کے پاس اصلاح کے لیے آیا ہوا ہوتا تھا، استاد کے انتقال کے بعد انھیں بھی استاد کا زادہ فکر خیال کرتے ہوئے شاملِ دیوان کردیا جاتا تھا۔ قائم سودا کے شاگرد تھے۔ ان کا یہ شعر:

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ

کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

سودا کے کلیات میں شائع ہوا، حالانکہ یہ شعر قائم نے اپنے تذکرے مخزنِ نکات میں اپنے ترجمے میں شائع کیا ہے۔(۶۴)

(۱۶) آزاد کا آبِ حیات ترجمۂ ناسخ میں بیان ہے:

''سیاحی کی مسافت فیض آباد سے لکھنؤ اور وہاں سے الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد پٹنہ تک رہی، چاہا تھا کہ شیخ علی حزیں کی طرح بنارس میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ الٰہ آباد سے وہاں گئے، مگر اپنی ملّت کے لوگ نہ پائے، اس لیے دل برداشتہ ہو کر عظیم آباد گئے۔ وہاں کے لوگ نہایت مروّت اور عظمت سے پیش آئے، مگر ان کا جی نہ لگا۔ گھبرا کر بھاگے اور کہا کہ یہاں میری زبان خراب ہوجائے گی۔ الٰہ آباد میں آئے۔ پھر شاہ اجمل کے دائرہ میں مرکز پکڑا اور کہا:

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم

آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں(۶۵)

قاضی صاحب ناسخ کے الٰہ آباد بلائے جانے کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ناسخ کے حیدر آباد بلائے جانے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی سند پیش نہیں کی، اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔''(۶۶)

قاضی صاحب نے الٰہ آباد لکھا ہوگا، جو غالباً کاتب کی غلطی کی وجہ سے حیدر آباد چھپ گیا ہوگا، کیونکہ آبِ حیات میں حیدر آباد کا ذکر نہیں۔ اسی طرح قاضی صاحب نے ناسخ کے پٹنہ آنے کے بارے میں بھی عدم ثبوت پر اعتراض کیا ہے۔(۶۷) قاضی صاحب کو معلوم نہیں کہ ناسخ کے الٰہ آباد بلائے جانے کے حوالے سے جو باتیں آزاد نے آبِ حیات میں درج کی ہیں، وہ آزاد کی اپنی نہیں، بلکہ رغمی کے بھیجے ہوئے خط سے ماخوذ ہیں۔ رغمی کا بیان ہے:

"دیگر وقتی که الہ آباد تشریف داشتند و درآں ایام مرزا کلب حسین خان بھادر تحصیلدار مقام سورانول برسرحد نوابودہ اند، تمنا کردند کہ شیخ صاحب برائے چندے بہ مقام تحصیلے رفتہ قیام ورزند وسیر سبزہ زار آں جافر مایند۔ چنانچہ بمزید التماس شیخ صاحب درآں جا تشریف بردن ویك ہفتہ اقامت فرمودند۔ روزے چناں افتاد کہ درطعام شیخ صاحب ..." (۶۸)

اور جہاں تک پٹنہ آنے کا تعلق ہے یہ آزاد کا اپنا اضافہ ہے۔ بنارس اور عظیم آباد آنے کا ذکر ضرور رغمی نے کیا ہے۔ (۶۹)

(۱۷) آزاد نے آبِ حیات ترجمۂ سودا میں یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''آصف الدولہ مرحوم کی انّا کی لڑکی خردسال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً تحمل اور بے پروائی تھی، دوسرے اس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا نواب سوتے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ یہ بدخواب ہو کر جاگ اُٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب کو غصہ آیا ہے، خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ بھئی مرزا! اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے تم اس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مصالح تیار تھا۔ اُسی وقت قلمدان لے کر بیٹھ گئے اور مثنوی تیار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڑ پیلے'' (۷۰)

خلیق انجم نے آزاد کی اس روایت پر سخت گرفت کی ہے۔ ان کا بیان ہے: یہ شعر 'مثنوی در ہجو کی، یعنی دخترِ دایہ' میں شامل ہے۔ یہ مثنوی اتنی فحش اور مبتذل ہے کہ اس معصوم بچی کی ہجو نہیں ہو سکتی، جس کی ماں کا آصف الدولہ نے دودھ پیا تھا۔ ابتدائی اشعار میں صاف طور پر دائی اور اس کی دختر کا ذکر کیا گیا ہے۔ خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اس شعر سے فائدہ اُٹھا کر آزاد نے ایک لطیفہ بنا دیا۔'' (۷۱)

اس مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر اکبر حیدری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مثنوی محمود آباد مخطوطہ نمبر ۲۱، نمبر ۲۲ اور نسخہ محمود آباد میں موجود ہے اور سب سے پہلے نسخۂ مصطفائی ص ۱۵۰ میں ۱۲۷۲ ہجری میں مثنوی شانز دہم 'در ہجو کی، یعنی دخترِ دایہ' کے عنوان سے چھپی تھی۔ نولکشور کے نسخہ اول و دوم میں بھی شائع ہوئی تھی، البتہ نسخۂ سوم سے خارج کر دی گئی تھی۔ نسخۂ آسی میں بھی نہیں (۷۲)۔ یہ روایت درست ہو یا نہ ہو، لیکن اس بات میں صداقت ہے کہ نواب آصف الدولہ، سودا سے لوگوں کی ہجو کہلواتے تھے۔ شاہ کمال نے اسی طرح کی ایک روایت نقل کی ہے۔ روایت یہ ہے:

''میر چھجو نامی شخصے بود کہ 'مھوا' چڑ داشت بحضور نواب آصف الدولہ مرحوم بھمیں مسخرگی ممتاز بود. چنانچہ یك روز نواب صاحب معز الیہ بمرزا رفیع السودا مذکور فرمائش ساختند کہ یك غزل بہ زمین مھوا (کذا) گفتہ بدھند .چنانچہ مرزا صاحب از حضور رخصت شدہ بہ مکانِ خود آمدہ غزلے بہ زمین مھوا کہ ووھی ھم دراں جا می چسپید گفتہ بحضور فرستادند ...غزل اینست'':

جگ میں تخمِ شراب ہے ووہی
ہرزہ گوئی کا باب ہے ووہی

میر غصہ میں یوں تو کب آویں
موجبِ پیچ و تاب ہے ووہی

سارے میووں میں باغِ دہر کے بیچ
اونھوں کا انتخاب ہے ووہی

سیر اس باغ کی کریں ہیں یہ
جس طرف بے حساب ہے ووہی

عرق اب کھینچ کر گلوندی کا
چھڑکو اِن پر گلاب ہے ووہی

بسکہ رہتا ہے ان کو اس کا خیال
سوتے میں بھی بخواب ہے ووہی

دانہ سُبحہ گر کریں اِس کو
اُن کے حق میں ثواب ہے ووہی

بھونے کوئی جو اِس کو گیہوں میں
ان کی خاطر کباب ہے ووہی

میم و ہے واؤ اور الف کا ذکر (کذا)
ان سے کچے کباب ہے ووہی

ان کے آگے جو لے مفصّل نام
گویا افراسیاب ہے وو ہی
میر چھچھو جو گالے دیں سودا
پاس میرے جواب ہے وو ہی (۷۳)

اس حکایت اور اشعار سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ روایت بھی درست ہو سکتی ہے اور ممکن ہے آزاد تک یہ روایت سینہ بہ سینہ پہنچی ہو۔ مذکورہ بالا حکایت کے پیشِ نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آبِ حیات میں درج حکایت بھی درست ہو اور آزاد نے جس ہجو کی نشاندہی کی ہے، وہ ہجو بھی آصف الدولہ نے سودا سے کہلوائی ہو۔

(۱۸) آبِ حیات میں آزاد نے یہ شعر سودا سے منسوب کیا ہے:

برابری کا تیری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار تھپیڑا منہ اس کا لال کیا (۷۴)

قاضی عبدالودود کی تحقیق یہ ہے کہ تذکرہ قدرت اللہ شوق میں یہ مطلع فتح چند ممنون کے نام سے دیا گیا ہے اور بعض تذکروں میں یہ پوری غزل حیدری کی طرف منسوب ہے (۷۵)۔ نثار احمد فاروقی نے طبقات الشعراء کو مرتب کیا ہے۔ اس شعر کے حاشیے میں تحریر کیا ہے کہ یہ شعر ممنون کا نہیں۔ تذکروں میں سودا کے نام سے درج ہے۔ (۷۶)

(۱۹) آزاد نے آبِ حیات میں انشاء کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''تیسرا رنگ میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ میں سوداگری کے لیے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا اور سرا میں اُترا۔ شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسہ میں پہنچا۔ ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے؛ حقے پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں؛ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پیکیوں کا توبڑا ڈالے، ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اُس سے مزاج پُرسی بھی کی۔ اُس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمبا کو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی! ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اُسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑگڑی سٹک پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بے دماغ ہو کر بولا کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اُس کی بات کے لیے تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں صاحب! ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا: جناب! لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آ جائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب! ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی:

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ زور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے!
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ؛ کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلے گئے، مگر زمین وآسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔" (۷۷)

راقم الحروف نے آبِ حیات کو مرتب کیا ہے۔ اس واقعے کے حوالے سے حواشی میں لکھا: "آزاد اس غزل کو انشاء کے آخری زمانے کی خیال کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔ مصحفی نے تذکرۂ ہندی ص ۲۵ میں اس غزل کے کچھ اشعار دیے ہیں۔ تذکرۂ ہندی کا سال اختتام ۱۲۰۹ھ ہے۔ اس سے انشاء کی غزل کے زمانۂ تخلیق پر روشنی پڑتی ہے۔" (۷۸) فرحت اللہ بیگ کے بیان سے اس غزل کے زمانۂ تخلیق پر مزید روشنی پڑتی ہے، لکھتے ہیں: "یہ غزل اس زمانے کی نہیں، جب سید انشاء لکھنؤ میں تھے، بلکہ اس زمانے کی ہے، جب وہ دہلی میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل دہلی کے کسی مشاعرے کی طرح پر کہی گئی ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض شعراء دہلی کی غزلیں اسی بحر و ردیف وقافیہ میں ہیں اور تو اور خود انشاء کے مدِ مقابل مرزا عظیم بیگ کی جو غزل ہے، اس کا مطلع ہے:

نگاہِ یار سے ہو مست یوں ہشیار بیٹھے ہیں

کہ جوں خورشید ننگے سر سرِ دربار بیٹھے ہیں(۷۹)

ڈاکٹر حسن آرزو نے نشاندہی کی ہے کہ اسی زمین میں رنگین کی دو اور غزلیں ملتی ہیں جو اُن کے دیوان دوم ریختہ میں موجود ہیں۔ان کا غزلوں کا زمانہ بقولِ رنگین: ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۱۲ھ کے درمیان سمجھنا چاہیے۔رنگین کی پہلی غزل کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:

پہنچ ساقی کے میخانے میں آ میخوار بیٹھے ہیں
نہ شیشہ ہے نہ مے ہے سب یوں ہی بیکار بیٹھے ہیں
مقابل اس غزل کے پڑھ غزل اک اور اے رنگیں
سب اہلِ فکر سننے کو تیرے اشعار بیٹھے ہیں(۸۰)

مذکورہ بالا تمام شہادتیں درست ہیں، لیکن ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ انشاء نے اس مشاعرے میں اپنی پرانی غزل ہی پڑھ دی ہو۔ایسا کرنے میں کوئی ممانعت بھی نہ ہوگی۔اگر ممانعت ہو بھی،تب بھی ضروری تو نہیں کہ کسی نے اس مشاعرے میں یہ غزل سنی ہو۔نہ وقت وہ ہے، نہ مقام۔مزید یہ کہ آزاد نے انشاء کی جس حالت کا بیان کیا ہے اس میں یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے تازہ غزل نہ کہی ہو اور یہاں پرانی غزل ہی پڑھ دی ہو۔اس حالت میں لوگوں کو بھی تو مایوسی نہ ہوئی ہوگی۔

(۲۰) آزاد کا آبِ حیات میں بیان ہے:

''اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جن میں ردیف وار ۱۰۱ مطلعے ہیں اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔اسی رعایت سے اُس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔یہ تسبیح بھی استادِ مرحوم نے پروئی تھی اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لگائی تھی۔''(۸۱)

آزاد کے اس بیان پر آبِ حیات کے حواشی میں راقم الحروف نے وضاحت کی: عمدۂ منتخبہ میں ان کے سو مطلعے موجود ہیں، جبکہ آزاد ۱۰۱ لکھتے ہیں(۸۲)۔اسی طرح گلستانِ سخن میں بھی تسبیحِ زمرد کو سو بیت لکھا ہے(۸۳)،لیکن جب راقم الحروف نے دیوانِ معروف دیکھا تو اس میں 'قطعہ در تاریخ تسبیحِ زمرد تصنیفِ محمد ابراہیم ذوق' کے نام سے تیرہ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ موجود ہے، جس میں ایک سو ایک مطلعے کا ذکر ہے۔دو شعر دیکھیے:

صد و یک مطلعِ رنگیں آخر
گفت با نالۂ گرم و دمِ سرد
شد چو تسبیحِ زمرد نامش
رونقِ آبِ گہر رفت بگرد

اور اس کی یہ تاریخیں کہی ہیں۔

ذوق چوں خواست دو تاریخش
اندریں دفترِ معنی بدو فرد
۱۲۳۶ھ

اول از دانہ خوش رنگ شمار
گرد و آں عقدۂ مطلب واکرد
۱۲۳۶ھ (۸۴)

(۲۱) آزاد کا آبِ حیات میں مرزا غالب کے حوالے سے بیان ہے:

"ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان بہادر کی سرکار میں ۳سو سواروں کی جمعیت میں ملازم رہے۔" (۸۵)

کالی داس گپتا رضا نے نشاندہی کی ہے کہ یوسف حسین خان نے آزاد کے اس بیان کو درست قرار نہیں دیا۔ ان کا بیان ہے کہ نواب نظام علی خان کے منصب داروں کی فہرست میں ان (غالب کے والد) کا نام نہیں ہے، اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدر آباد میں بہت معمولی حیثیت سے کارگزار رہے ہوں گے (۸۶)، یعنی تین یا چار سو کی جمعیت کے رسالدار نہیں ہوں گے۔ کاظم علی خان نے نشاندہی کی ہے کہ یہ روایت آزاد نے غالب کے ایک خط سے حاصل کی ہے۔ یہ خط غالب نے منشی حبیب اللہ ذکا کو جمعہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۷ء کو تحریر کیا تھا۔ یہ خط اردوئے معلیٰ طبع اول ص ۳۴۔۳۶ شامل ہے۔ یہی روایت یادگارِ غالب ص ۱۱ میں بھی موجود ہے۔ اگر یہ روایت درست نہیں، تب بھی ذمہ داری آزاد پر نہیں، غالب پر آئے گی۔ (۸۷)

(۲۲) آزاد نے آبِ حیات کے ترجمۂ غالب میں حاتم علی بیگ کے نام غالب کے خط کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"اردوئے معلیٰ' میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو تحریر فرماتے ہیں: 'میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے، اُنھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لی:

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اِسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرایئے گر مُہرِ نماز
میکدہ میں اِسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔اشعار سب کب یاد آتے ہیں؟ بھول گیا۔" (۸۸)

مذکورہ بالا قطعہ کے چھٹے شعر پر راقم الحروف نے اپنی مرتبہ آبِ حیات کے حاشیے میں لکھا:

"یہ ایک شعر نہیں، دو اشعار کے دو مصرعے ہیں۔اشعار کی صحیح صورت یہ ہے:

مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے (۸۹)

راقم الحروف کا اعتراض درست تھا، لیکن یہ غلطی بھی آزاد سے نہیں، غالب سے ہوئی۔ آزاد نے چونکہ غالب کا یہ بیان حاتم علی بیگ مہر کے نام خط سے نقل کیا تھا اور اشعار بھی اسی خط سے نقل کیے تھے، اس لیے اعتراض آزاد پر نہیں، بلکہ غالب پر وارد ہوتا ہے۔ چونکہ راقم الحروف کو غالب کی اس غلطی کا علم نہیں تھا، اس لیے میں نے اس غلطی کو آزاد کی غلطی پر محمول کیا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب نے میرے نام ۱۹؍جولائی ۲۰۰۷ء کے خط میں نشاندہی کی کہ یہ غلطی آزاد سے نہیں، غالب سے ہوئی ہے۔ راقم الحروف نے غالب کا خط دیکھا تو حقیقت کا علم ہوا۔(۹۰)

(۲۳) آزاد نے آبِ حیات میں جرأت کے ترجمے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''کریلا ایک پراتم بھانڈ دلّی کا رہنے والا۔ نواب شجاع الدولہ کے ساتھ گیا تھا اور اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر، دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا اور کہنے لگا کہ: حضور! شاعر بھی اندھا؛ شعر بھی اندھا؛ مضمون بھی اندھا۔

صنم سُنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے، مگر یہ بھی سید انشاء اور مرزا قتیل کے جتھے کے جزوِ اعظم تھے۔ گھر آ کر اُنھوں نے بھی اُس کی ہجو کہہ دی اور خوب خاک اُڑائی۔ اُسے سن کر کریلا بہت کڑوایا۔ چنانچہ دوسرے جلسہ میں پھر اندھے کی نقل کی، اُسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے:

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ
کیا رات ہے؛ کیا رات ہے؛ کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ کیا رات ہے؛ کیا رات ہے؛ کیا رات ہے واللہ۔ اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ پر ہے۔ چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں پڑھتا پھرا۔ شیخ صاحب اور بھی غصہ ہوئے اور پھر آ کر ایک ہجو کہی۔ ترجیع بند تھا۔ (باپ کی ہجو ماں کی زبانی):

بگلا جھولے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے

اُس کو بھی خبر ہوئی، بہت جلا بھُنا۔ پھر کسی محفل میں ایک زچہ کا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھتنا گھس گیا ہے۔ خود ملّا بن کر بیٹھا اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے، اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ: ارے نامراد! کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے؟ جرأت ہے تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کر دوں۔ آخر اب کی دفعہ انھوں نے ایسی خبر لی کہ کریلا خدمت میں حاضر ہوا۔ خطا معاف کروائی اور کہا کہ میں اگر آسمان کے تارے توڑ لاؤں گا تو بھی اِس کا چرچا وہیں تک رہے گا، جہاں تک دائرۂ محفل ہے۔ آپ کا کلام منہ سے نکلتے ہی عالم میں مشہور ہو جائے گا اور پتھر کی لکیر ہوگا کہ قیامت تک نہ مٹے گا۔ بس اب میری خطا معاف فرمایے۔'' (۹۱)

مصحفی کے شاگرد میر بہادر علی وامق (م ۱۲۷۰ھ) نے ایک کتاب قصر اللطائف لکھی۔ اس کے کچھ اقتباسات خیراتی لعل بے جگر نے تزکرے میں دیے ہیں۔ یہ تذکرہ ۳۶ ۔ ۱۲۲۸ھ کے درمیان لکھا گیا۔ گو اضافے ۱۲۴۳ھ تک ہوتے رہے۔ اس میں قصر اللطائف سے لے کر کچھ لطیفے بھی دیے ہیں، جن میں سے ایک یہی کریلا اور جرأت کا ہے۔ اس کے مطابق نواب آصف الدولہ کے حضور میں جرأت اور کریلا موجود تھے۔ وہاں کریلا نے بالکل یہی الفاظ کہے: ای

پیر و مرشد !شاعرانِ ایں زمانه هم کور آمد و شعرِ ایشاں هم کور اوراس کے بعد یہ شعر پڑھا:

جو سنتے ہیں میاں تیرے کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ اور کدھر ہے؟

اور تمام فرش کو اپنے ہاتھ سے ٹٹولتے پھرا۔(۹۲)

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ اگر یہ حوالہ نہ ملتا تو اس لطیفے کو بھی آزاد کا جعل قرار دیا جاتا۔ انھوں نے وامق کی قصر اللطائف دیکھی ہوگی، یا پھر کوئی اور کتاب، جس نے بھی سب سے پہلے اس نقل کو لکھا، اس نے شعر کو جرأت سے منسوب کر کے اپنے تخیل کا زور دکھایا۔(۹۳)

ماحصل:

آزاد کے پیش کردہ بیانات، واقعات اور ان کے حوالے سے لگائے گئے اعتراضات، ان عتراضات کی تردید اور درست صورتِ حال کے تناظر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آزاد اور ان کی تصانیف کے حوالے سے کیے گئے بہت سے اعتراضات عدم واقفیت، غلط فہمی، حقائق سے لاعلمی اور جلد بازی کی بنا پر کیے گئے ہیں۔ چونکہ بیسویں صدی کے آغاز تک آزاد کی تصانیف کے کچھ مآخذ محققین کے پیشِ نظر نہیں تھے، اس وجہ سے بہت سے اعتراضات اور الزامات لاعلمی کی بنا پر لگا دیے گئے۔ بیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے صورتِ حال بدل چکی تھی۔ جدید سائنسی ایجادات، نئے مآخذ کی دریافت، نادر و نایاب کتب کی اشاعت اور لاعلمی کی دھند کے چھٹ جانے کے بعد بہت سے حقائق سامنے آئے اور آزاد کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ حافظ محمود شیرانی نے مجموعۂ نغز مرتب کیا۔ اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اس تالیف کی حقیقی وقعت کا اس وقت اندازہ ہوتا ہے، جب مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور عالم تصنیف آبِ حیات کی ورق گردانی کی جاتی ہے۔ مولانا نے اگرچہ ہر موقع پر اس تالیف سے استفادے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ تاہم وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آبِ حیات کا ایک بڑا حصہ اس تذکرے سے ماخوذ ہے۔'' (۹۴)

دراصل قدیم دور میں لکھی جانے والی تحقیقات میں مآخذ کی نشاندہی کرنے اور حوالہ دینے کا رواج نہ تھا اور نہ ہی پڑھنے والے محقق رمصنف سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اپنے مآخذ کی نشاندہی کریں۔ یہ محقق، یا مصنف کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ جس واقعے سے متعلق ضروری سمجھتا حوالہ دے دیتا، یا مآخذ کی نشاندہی کر دیتا اور جس کا ضروری نہ سمجھتا، اس کے مآخذ کی نشاندہی نہ کرتا۔ انیسویں صدی کی تمام تحقیقی تصانیف کا مطالعہ کیجیے۔ اپنی تصانیف کے مکمل مآخذ کی نشاندہی کرنے والا شاید ہی کوئی مصنف دستیاب ہو۔ تاہم جو مصنفین اپنی تصانیف میں مآخذ کی نشاندہی کرتے تھے، وہ بھی چند مآخذ کی نشاندہی پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ جدید دور کا آغاز ہوا تو علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ تحقیقی اصول بھی مرتب کیے جانے لگے؛ ہر بات کا حوالہ طلب کیا جانے لگا؛ ہر موقف کی دلیل طلب کی جانے لگی۔ آج کل ہر بات پر آنکھ بند کر کے

یقین نہیں کیا جاتا، اس کا ثبوت، یا شہادت بھی طلب کی جاتی ہے اور بغیر ثبوت، سند، یا حوالے کے پیش کی گئی روایت، یا بیان بے اعتبار، یا مشکوک ٹھہرتا ہے۔

ہر عہد کا اپنا مزاج اور تناظر ہوتا ہے۔ ہر تصنیف کو اس کے اپنے عہد کے تناظر میں پرکھا جانا چاہیے۔ آزاد نے جس عہد میں آبِ حیات تصنیف کی، اس عہد کی تاریخ، یا تحقیق: مورخ، یا محقق سے وہ تقاضے طلب نہیں کرتی تھی، جو آج کی تاریخ اور تحقیق طلب کرتی ہے۔ آزاد کے عہد تک ادبی تاریخ نویسی اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکی تھی۔ ان کے عہد میں تذکرہ نویسی کے رجحان کا دستور تھا۔ تذکروں میں ہر اہم و غیر اہم شاعر کا ترجمہ شامل کر دیا جاتا تھا۔ ان تذکروں میں شامل تراجم کا کوئی معیار نہ ہوتا ہے۔ شعراء کے تراجم کی شمولیت، یا عدم شمولیت تذکرہ نگار کی مرضی پر منحصر ہوتی تھی۔ تذکروں سے نہ کسی عہد کا شاعرانہ ارتقاء معلوم کرنے میں مدد ملتی تھی، نہ زبان و بیان کے بدلتے اسالیب پر روشنی پڑتی تھی۔ البتہ شعراء کے تراجم لکھتے ہوئے تذکرہ نگار ایسے بیانات ضرور لکھ جاتے تھے، جنھیں تنقیدی اشاروں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ آزاد وہ پہلے ادیب تھے، جنھوں نے تاریخ نویسی کا ڈول ڈالا اور آبِ حیات میں پہلی مرتبہ اردو شاعری کا ایک مربوط اور منظم ارتقاء دکھانے کی کوشش کی۔ اردو شاعری کا ارتقاء دکھانے کے لیے شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا اور ان ادوار میں ہر عہد کا ادبی اور شعری مزاج متعین کرنے کی کوشش کی۔ زبان و بیان کے اسالیب پر روشنی ڈالی۔ شعراء کے کارناموں پر مربوط انداز میں روشنی ڈالی۔ شعراء کا تنقیدی مقام متعین کیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ آزاد صرف اور صرف تاریخ نہیں لکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسی کتاب لکھنا چاہتے تھے، جو ایک طرف تاریخ کے تقاضے بھی پورا کرتی ہو اور دوسری طرف ماضی کی گرد میں دب جانے والے واقعات اور حالات کو اس طور پر پیش کرے کہ انھیں پڑھنے والا اپنی چشمِ تصور سے دیکھ بھی سکتا ہو۔ ایسی تاریخ لکھنے کے لیے انھیں جذبے اور تخئیل کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر وہ اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا آبِ حیات لکھتے ہوئے انھوں نے ان دونوں خوبیوں کا استعمال بھرپور انداز میں کیا۔ اس طرح آبِ حیات فقط روکھی پھیکی اور سپاٹ تاریخ ہی نہیں رہی، بلکہ دلچسپ اور ڈرامائی تاریخ بن کر سامنے آئی۔

آزاد ایک محقق تھے۔ ان میں تحقیق کا مادہ موجود تھا۔ وہ تحقیق کرنا جانتے تھے۔ تحقیق میں تسامحات سے واسطہ پڑتا ہے؛ ٹھوکر لگتی ہے؛ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے؛ نتائج کا استنباط غلط ہو سکتا ہے، لیکن کوئی بھی محقق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ معصوم عن الخطا ہے، اس سے تحقیقی غلطی نہیں ہو سکتی۔ آزاد ایک انسان تھے۔ ان سے تحقیقی تسامحات ہوئے۔ بعض اوقات انھوں نے نتائج اخذ کرنے میں ٹھوکر بھی کھائی اور کہیں کہیں شعوری طور پر غلط بیانی کا ارتکاب بھی کیا؛ حقائق بھی چھپائے؛ حقائق کو مسخ بھی کیا۔ (راقم السطور اپنی مرتبہ کتاب آبِ حیات میں ان غلط بیانیوں کو سامنے لا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ ان حقائق کو سامنے لانے کا مقصد ذاتی چپقلش، نفرت، یا آزاد دشمنی نہیں، بلکہ یہ سب کچھ ہمدردانہ تحقیق کے زیرِ اثر تحریر کیا گیا ہے۔) ان سب باتوں کے

باوجود میرا موقف یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آزاد ہی سے ہوا؟ کسی اور سے نہیں ہوا، یا کسی اور نے نہیں کیا؟ ایسا ہرگز نہیں۔ پچھلے صفحات میں کلامِ ذوق پر آزاد کی خود کردہ اصلاحوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ثابت بھی کیا گیا ہے کہ یہ طرزِ عمل فقط آزاد ہی سے سرزد نہیں ہوا، بلکہ آزاد سے پہلے بھی کئی شاعروں نے اس طرح کا طرزِ عمل روا رکھا ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ یہ طرزِ عمل ہر شاعر کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا، لیکن تاریخ ہمیں یہ ضرور بتاتی ہے کہ اس طرح کا طرزِ عمل کئی شاعروں کے ساتھ ہوا ضرور ہے۔ جب دوسروں کے ساتھ آزاد کی طرح کا ناروا سلوک نہیں کیا گیا تو آزاد کے ساتھ کیا جانے والا وہ ناروا سلوک نامناسب تھا، جسے اردو تحقیق نے روا رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا جارحانہ رویہ تحقیق کی روح کے منافی ہے۔ اس لیے اس قسم کے رویے سے ہر جگہ گریز کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا نقطۂ نظر صرف یہ ہے کہ آزاد پر تحقیق ہونی چاہیے؛ ان کی تصانیف کا تنقیدی مقام متعین کیا جانا چاہیے، لیکن ایسی تحقیق وتنقید ہونی چاہیے، جو غیر جانبدارانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدردانہ بھی ہو، کیونکہ تحقیق کا بھی اور تنقید کا بھی یہی بنیادی اصول ہے۔

اردو کی ادبی تواریخ میں آبِ حیات کو اولیت کا مقام حاصل ہے اور جو تصنیف اولیت کے مقام پر فائز ہو، اس سے وہ تقاضے نہیں کیے جاتے، جو بعد کی تصانیف سے کیے جاتے ہیں۔ اردو کے اولین افسانوں، ناولوں، سفرناموں اور نظموں وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے آج کا محقق اور نقاد وہ تقاضے نہیں کرتا، جو موجودہ عہد کے افسانوں، ناولوں، سفرناموں اور نظموں سے کرتا ہے۔ لہٰذا آبِ حیات سے بھی وہ تقاضے نہیں کیے جاسکتے، جو اولین تصانیف سے کیے جاتے ہیں۔ آزاد نے جن حالات میں آبِ حیات جیسی معرکہ آرا تاریخ تخلیق کی، وہ آزاد کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی آبِ حیات کے سلسلے میں آزاد کی ادبی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''مگر یہ بزرگ بھول گئے کہ آج سے ساٹھ سال قبل جب آبِ حیات تالیف ہوتی ہے، ذرائع معلومات نہایت محدود تھے۔ اس عرصے میں بیسیوں کتابیں روشنی میں آئیں اور انجمن ترقیِ اردو نے چھاپ دیں، جو آزاد کے زمانے میں عنقا کا حکم رکھتی تھیں اور ان تک حضرت مولانا کی رسائی نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے جو متنوع اور یکجا اطلاع آبِ حیات سے حاصل ہو سکتی ہے، دیگر تصانیف میں اس کا عشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا اور آج بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حکیم عبدالحئی مصنف گلِ رعنا اور شیخ چاند مؤلفِ سودا، جو مولانا کے قابل نقاد ہیں، اگر ایک صفحے پر آبِ حیات کی تنقید کر رہے ہیں تو دوسرے صفحے پر اس سے حوالہ بھی دے رہے ہیں۔'' (۹۵)

مزید یہ کہ آزاد نے پہلی مرتبہ تذکرہ نگاری کی روایت سے قدم آگے بڑھا کر ادبی تاریخ نویسی کی روایت کا آغاز کیا۔ پہلی بار شعراء کے حالات تحقیق کر کے تحریر کیے اور ان کی زندگی کے قابلِ ذکر پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ تذکروں کی طرح رطب ویابس کو آبِ حیات میں جگہ نہیں دی۔ شعراء کے کلام پر گہرے تنقیدی انداز میں نظر ڈالی۔ ہر شاعر اور اس کے کلام

کی بنیادی خصوصیت کو اُجاگر کیا۔ آبِ حیات میں آزاد نے شعراء کی جو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، آج کا نقاد بھی آزاد کی بنائی ہوئی تصویر کو مکمل طور پر رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ تنقید کی زبان کو مبالغے اور غلو کی سرحدوں سے نکال کر معروضی بنانے کی کوشش کی۔ اردو شاعری کا ارتقاء دکھانے کے لیے ادوار قائم کیے اور ہر دور کی بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالی۔ اس طرح آزاد اردو کی ادبی تاریخ نویسی کے سرخیل اور ایک اہم ادبی مؤرخ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

اسی طرح دیوانِ ذوق کو مرتب کرتے ہوئے آزاد نے جو طریق کار اختیار کیا، وہ آزاد کا ساختہ و پرداختہ تھا۔ اس عہد میں دیوان کو مرتب کرنے کے اصول وضع نہیں ہوئے تھے۔ اس عہد میں کسی بھی شاعر کے کلام کو فقط حروفِ تہجی سے ترتیب دے کر شائع کر دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاتا تھا کہ دیوان کے آخر میں مقفع و مسجع نثر اور چند تاریخیں شامل کر دی جاتی تھیں۔ کسی کسی دیوان میں شاعر کے حالاتِ زندگی بھی شامل کر دیے جاتے تھے۔ آزاد نے پہلی مرتبہ کسی بھی شاعر کے کلام کو مرتب کرنے کے اصول وضع کیے۔ یہ اصول خود آزاد کے وضع کردہ تھے۔ آزاد نے ذوق کے کلام کو مرتب کرنے کے بعد ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا، جس میں ذوق کے حالات تحریر کیے، ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی۔ کلامِ ذوق کا سالِ تخلیق متعین کیا۔ ذوق کے کلام کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کیں اور مشکل الفاظ کے معنی و مفاہیم بیان کیے۔ غرض یہ کہ کسی بھی کلام کو مرتب کرنے کے، جو جدید اصول آج کل رائج ہیں، وہ سب آزاد نے دیوانِ ذوق کی ترتیب میں استعمال کیے۔ اس طرح اردو میں تدوین کی روایت میں بھی آزاد کا کردار اولیت کا حامل ہے۔

آزاد دہلی کے باشندے تھے۔ انیسویں صدی کی پیداوار تھے۔ غالب، ذوق، مومن، دبیر، انیس اور ان جیسے شاعروں کی آنکھیں دیکھی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کو جانتے تھے، جو انیسویں صدی کی ادبی و شعری روایت کے امین تھے۔ ادیبوں اور شاعروں سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ ان کی محفلوں میں شریک رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں معاصر عہد سے متعلق آزاد کے اپنے بیانات بھی اتنے ہی اہم ہیں، جتنے اس عہد کے دوسرے ادیبوں کے بیانات، یا تحریریں۔ جب آزاد کے معاصر ادیبوں کے بیانات، یا تحریروں کو ہم اہمیت دیتے ہیں اور وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو آزاد کے بیانات کو بھی اتنی ہی اہمیت اور وقعت دینی چاہیے، جتنی ان کے معاصر ادیبوں کو دی جاتی ہے۔

آج کے دورِ تحقیق میں حافظے سے زیادہ نقل نویسی پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے، جبکہ آزاد کے دور میں اور ان سے پہلے کے دور میں نقل اور حافظے دونوں کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس عہد میں کسی موقف کو پیش کرتے ہوئے، یا کسی بیان کو تائید میں پیش کرتے ہوئے حافظے کا استعمال بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ غالب نے بھی اپنے حافظے کے زور پر ہی قتیل کی لغت برہانِ قاطع میں موجود غلطیوں کی نشاندہی حافظے کے زور پر کر کے ایک کتاب ترتیب دے ڈالی، جو قاطعِ برہان کے نام سے ۱۸۶۲ء میں مطبعِ منشی نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی (۹۶)۔ مزید یہ کہ آج کے دور کی طرح نہ اس زمانے میں

پریس کا رواج تھا اور نہ کثرت سے کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کتاب خانوں کی تباہی نے تو کتابوں کی دسترسی اور دستیابی بے حد مشکل بنا دی تھی۔ رہی سہی کسر جرمنی، انگلستان اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے 'محققین' نے اپنے ملکوں میں نادر و نایاب کتابیں منتقل کر کے پوری کر دی تھی، جو بچے کھچے کتاب خانے باقی رہ گئے تھے، ان کا حال بھی ابتر تھا۔ ایک ایک کتاب کے لیے مارا مارا پھرنا پڑتا تھا۔ آزاد نے ایسے ہی ابتر حالات میں لاہور میں اپنا کتب خانہ تشکیل دیا اور قطرہ قطرہ کر کے کتابیں جمع کیں۔ بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کے حالات پر سکون ہو چکے تھے۔ اشاعتی ادارے بڑی تیزی کے ساتھ کتابیں شائع کر رہے تھے۔ بیسویں صدی کے وسط تک تو بے شمار نادر و نایاب کتابیں چھپ کر سامنے آ چکی تھیں۔ آج کل کے حالات انیسویں صدی کے حالات سے کہیں مختلف تھے۔ وہ نوادرات، جن کے نام آزاد نے سنے بھی نہ ہوں گے، وہ اشاعت کی منزل سے گزر کر محققین کے ہاتھوں میں آ چکے تھے، اس لیے آزاد کی تحقیق کا موازنہ آج کی تحقیق سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آزاد نے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں، ان کی اہمیت سے آج کی تحقیق بھی انکار نہیں کر سکتی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہر چھپی ہوئی تحریر سچ ہوتی ہے اور وہ بیان، جس کا تحریری ثبوت نہ ہو جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ کلیہ ہر واقعے پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے گرد و پیش میں ہونے والے کتنے ہی واقعات ایسے ہوتے ہیں، جو تحریر میں تو آ جاتے ہیں، لیکن ان کا سچ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، حقائق پر پڑی ہوئی دھند چھٹنے لگتی ہے اور جھوٹ کا چہرہ بے نقاب ہونے لگتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں پاکستان اور پاکستان سے باہر کئی واقعات ایسے رونما ہوئے ہیں، جن کے متعلق اس وقت جو کچھ بتایا جا رہا تھا، یا شائع ہو رہا تھا، بعد کی تحقیق نے ان واقعات کے بیان کردہ حقائق کو مسترد کر دیا۔ اسی طرح آزاد کے بیان کردہ واقعات پر غلط بیانی کے لگائے گئے بہت سے اعتراضات کچھ کتابوں کی اشاعتوں نے مسترد کر دیے۔ مجموعۂ نغز کی اشاعت سے بہت سے ایسے واقعات اور بیانات کی تصدیق ہوگئی، جنھیں پہلے پہل آزاد کی کذب بیانی پر محمول کیا گیا۔ بہت سے واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جو تحریر میں تو آ جاتے ہیں، لیکن حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے۔ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات، ان واقعات کی درست صورتِ حال پیش کرتی ہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں بہت سے واقعات ان لوگوں کی زبانی نقل کیے ہیں، جو ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ اب اگر ان واقعات کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہ ہو تو کیا ان کی حقیقت سے بھی انکار کر دیا جائے؟

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعے سے متعلق مختلف اور بسا اوقات متضاد روایات موجود ہوتی ہیں، مثلاً: ہمارے گرد و پیش میں کوئی واقعہ رونما ہو اور ہم اس واقعے سے متعلق اپنے دوست احباب سے استفسار کریں تو ان کے بیانات میں جزوی اختلافات پاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کچھ اور حقائق پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ایک

بات، یا نقطۂ نظر درست ہوگا، باقی سب بیانات غلط، یا جزوی غلط، یا جزوی درست ہوں گے۔ کسی ایک ہی بیان کو لے کر ہم اس واقعے کی صحت کا تعین نہیں کر سکتے۔ یہ محقق کا فرض ہے کہ وہ ان مختلف فیہ بیانات کو شہادتوں اور منطقی بنیادوں پر پرکھ کر ان کی صحت، یا عدمِ صحت کا فیصلہ کرے۔ آزاد کے بیان کردہ واقعات کو غلط ثابت کرنے کے لیے ضروری نہیں، کسی ایک ہی بیان کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ کر دیا جائے۔ اگر ایک سے زیادہ بیانات موجود ہوں تو ان کو روایت اور درایت کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

آزاد نے اتنی برائیاں نہیں کیں، جتنے وہ بدنام ہوگئے ہیں۔ کہتے ہیں: بد سے بدنام برا۔ اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ان کی ہر بات پر شک گزرتا ہے، یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کے ہر بیان کو جب تک استناد کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ نہ لیا جائے، دل کو اطمینان نہیں ملتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آزاد کے حوالے سے اس رویے سے گریز کیا جانا چاہیے۔

تحقیق تو ایک دشت ہے، جس کی سیاحی تو ہر شخص کرتا ہے، لیکن اس میں قیس بن کر سرخرو ہونا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند۔ تحقیق میں غلطیوں، فروگذاشتوں اور تسامحات سے کسی کو مفر نہیں۔ مولوی عبدالحق کا قول ہے:

> ''غلطی وہی کرتا ہے جو کچھ کرتا بھی ہے، جو کچھ کرتا نہیں، وہ غلطی کیا کرے گا؟ غلطیاں آئندہ آنے والوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام دیتی ہیں اور پکار پکار کر کہتی ہیں کہ خبردار اس طرف نہ آنا۔''

سعید احمد اکبر آبادی کا قول ہے:

> ''کسی علم وفن کا کوئی بڑے سے بڑا محقق اور دیدہ ور عالم بھی ایسا نہیں ہے، جس سے غلطیاں نہ ہوئی ہوں۔'' (۹۷)

جب دشتِ تحقیق کے بڑے بڑے محققین، دانشور اور علماء غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے تو آزاد کس طرح محفوظ رہ سکتے تھے؟ آزاد کو ہم دشتِ تحقیق کا قیس نہ سہی، ایک سیاح تو کہہ سکتے ہیں۔ ایسا سیاح جو دشتِ تحقیق کو عبور کرتے ہوئے کبھی راہ بھول گیا تو کبھی ٹھوکر کھا گیا۔ ایسی صورتِ حال میں آزاد کی سیاحی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً آزاد نے دشتِ تحقیق کو عبور کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں؛ راستے کھوئے ہیں؛ لغزشیں کی ہیں، پھر بھی یہ بات آزاد کو ان کے مرتبے سے گرا نہیں سکتی۔ آزاد نے آبِ حیات، سخندانِ فارس، دیوانِ ذوق، دربارِ اکبری اور نیرنگِ خیال جیسی ادبی اور محققانہ شان رکھنے والی تصانیف تخلیق کر کے اپنی صلاحیت، عظمت اور اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اردو کے تمام مصنفین اور ادیب بلا امتیاز اردو کے عناصرِ خمسہ میں شمار کرتے ہیں۔ اپنے معاصرین کی طرح ان سے بھی فروگذاشتیں اور تسامحات ہوئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان غلطیوں کی بنا پر آزاد کی علمی اور ادبی اہمیت سے یکسر انکار کر دیا جائے، یا ان کی ہر بات کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کو یکسر مسترد کر دیا جائے؛ ان کی تصنیفات کو کلیتہً پایۂ

اعتبار سے ساقط قرار دے دیا جائے؛ ان کی محنت پر پانی پھیر دیا جائے، اگر ایسا کیا گیا تو وہ آزاد، جسے شبلی جیسے کڑے مؤرخ اور ادیب نے 'خدائے سخن' کہا (۹۸) اور مہدی افادی جیسے باثر انشاپرداز نے 'اردوئے معلیٰ کا ہیرو' قرار دیا ہے، (۹۹) کے ساتھ سخت ناانصافی اور ظلم ہوگا۔ چنانچہ تحقیقی وتنقیدی دیانت کا تقاضا ہے کہ آزاد کی صحیح اور صاف ستھری تصویر پیش کی جائے، تاکہ اردو تحقیق کی تاریخ میں آزاد کا درست مقام متعین کرنے میں بھی مدد ملے اور عالمِ بالا میں آزاد کی روح بھی خوش ہو۔

حوالے اور حواشی

۱۔(i) افاداتِ مہدی: مہدی حسن رمہدی بیگم (مرتب): شیخ مبارک علی، لاہور: چہارم ۱۹۴۹ء: ص ۳۶۔

(ii) حیاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ: اکتوبر ۲۰۰۸ء: ص ۶۱۶۔

۲۔ نکات الشعراء: میر تقی میر رحبیب الرحمٰن خان شروانی (مرتب): مطبع نظامی پریس، بدایوں: س۔ن: ص ۲۴۔

۳۔ مقالاتِ شیرانی، جلد سوم: مظہر محمود شیرانی (مرتب): مجلس ترقیِ ادب، لاہور: جولائی ۱۹۶۹ء: ص ۴۰۔

۴۔ ذیل میں آزاد کے حوالے سے ایسے چند منتخب بیانات درج کیے گئے ہیں، جن میں آزاد کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے اور ان پر جارحانہ انداز میں اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان میں کچھ اعتراضات تو نامناسب اور غیر اخلاقی بھی ہیں۔ یہ تمام بیانات کسی ایک عہد کی تحریروں سے نہیں لیے گئے، بلکہ اِن بیانات کا دورانیہ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے:

(i) حامد حسن قادری کا بیان ہے: ''علامہ آزاد مؤرخ بھی ہیں اور نقاد بھی اور مؤرخ و نقاد کا پہلا فرض صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے، لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں، یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لیے، یا اپنے پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی مدح وذم کی خاطر، کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں، کبھی خلافِ واقعہ نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔'' (داستانِ تاریخِ اردو: حامد حسن قادری: لکشمی نراین اگروال تاجر کتب، آگرہ: دوم ۱۹۵۷ء: ص ۳۹۹)

(ii) ''آزاد نے ان (میر) کو دوسرے دور کے شعراء میں جگہ دی ہے، مگر یہ آزاد کی زبردستی ہے۔'' (گلِ رعنا: عبدالحئی، مطبع معارف، اعظم گڑھ: طبع سوم ۱۳۶۴ھ: ص ۳۲)

(iii) ''آزاد کی زبردستی اسی پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ سب سے بڑا ظلم انھوں نے یہ کیا ہے کہ۔۔۔۔'' (ایضاً)

(iv) ''آزاد نے آبِ حیات میں زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر جو بات نکالی ہے۔'' (محولہ بالا: ص ۳۴)

(v) ''آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آبِ حیات میں کھینچی ہے، وہ ان کے منہ پر کھلتی نہیں۔'' (محولہ بالا: ص ۱۵۵)

(vi) ''یہ اور اسی قسم کے بہت سے بیان آبِ حیات میں دیکھتا ہوں تو غرقِ حیرت ہو جاتا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہے۔'' (نکات الشعراء: ص ۲۲)

(vii) ''میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گزرا۔ قیاس کی بلند پروازی نے

طوطی مینا بنا کر اُڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی نے سامعین کو خوش کیا ہے۔'' (محولہ بالا: ص ۲۴)

(viii) ''آزاد کا یہ بیان محض تخیل کی پرواز ہے اور سراسر مبالغہ ہے۔ اس کی کوئی تاریخی، یا مستند روایتی سند موجود نہیں۔''

(آزاد بحیثیت محقق: قاضی عبدالودود: نوائے ادب بمبئی: اپریل تا اکتوبر ۱۹۵۶ء: ص ۲۸)

(ix) ''خسرو کے حال میں جتنی حکایتیں آبِ حیات میں درج ہیں، محض بازاری گپیں ہیں۔'' (محولہ بالا: ص ۲۷)

(x) ''آزاد نے جو جزئیات بیان کیے ہیں، اختراعی ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذریعہ ان کو معلوم کرنے کا نہ تھا۔'' (محولہ بالا: ص ۳۰)

(xi) ''جو ڈرامہ نواب کے سامنے ہوتا ہے سید اصلح الدین کی نظم میں کہیں مذکور نہیں۔ قصے کو ڈرامائی چاشنی دینے کے لیے فاخر مکین اور نواب کی گفتگو فارسی میں کرائی جاتی ہے۔'' (مقالاتِ شیرانی: ص ۱۰۶)

(xii) ''میرا خیال ہے آزاد نے اس سہو سے فائدہ اٹھا کر ایک دلچسپ لطیفہ بنا لیا۔'' (مرزا رفیع سودا: خلیق انجم: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء: ص ۱۰۹ و ۱۱۰)

(xiii) ''آزاد کی قوتِ اختراع اور انشا پردازی کے ثبوت میں یہی لطیفہ کافی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔'' (محولہ بالا: ص ۱۰۱)

(xiv) ''اب آزاد کا بیان ایک دلچسپ حکایت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔'' (محولہ بالا: ص ۲۹۷)

(xv) ''اس طرح چھپر کھٹ والا پورا واقعہ اختراعی ہے۔'' (اردو کی ادبی تاریخیں: گیان چند: انجمن ترقی اردو، کراچی: ۲۰۰۰ء: ص ۶۶)

(xvi) ''آزاد کا مقصد تو ایک فقرہ تراشنا تھا کہ میر نے اپنے کلام کو باغ پر ترجیح دی۔'' (محولہ بالا: ص ۶۰)

(xvii) ''رنگین کی زبانی انشا کی آخر عمر کے جو واقعات بیان کیے ہیں، وہ سرتاسر وضعی ہیں۔'' (محولہ بالا: ص ۶۷)

(xviii) ''ایک تیسرے صاحب نے۔۔۔ 'قاسم اینڈ آزاد پگڑی اچھال کمپنی' کی پرانی، گھٹیا اور ملاوٹی اشیاء کو بیچنے اور ان کو مشتہر کرنے کی دلالی شروع کر دی۔'' (ذکرِ میر میر تقی میر: مکتبۂ دین و ادب لکھنؤ: بار اول ۱۹۶۱ء: ص ۴۴)

(xix) ''غرض یہ کہ آزاد کی تمام باتیں جھوٹی اور بے سروپا ہیں۔'' (محولہ بالا: ص ۴۵)

(xx) ''ان کی (آزاد) تمام باتیں جھوٹی اور بے سروپا ہیں۔ حقیقتاً نکات الشعراء نہ تو آزاد نے دیکھا تھا اور نہ ہی قاسم نے۔ دونوں بہتان تراشی کے شدید مرض میں مبتلا تھے۔'' (محولہ بالا: ص ۴۶)

(xxi) ''آزاد نے ہم لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہم سے تعریف لوٹنے کی کوشش کی، لیکن نکاتِ (الشعراء) موجود ہے، وہ ان کے تمام بیانوں کی تکذیب کرتا ہے۔'' (محولہ بالا: ص ۴۸)

(xxii) ''حقیقت یہ ہے کہ قاسم اور آزاد نے اردو تحقیق کے ساتھ زبردست غداری کی ہے اور نکات اور میر پر بے بنیاد الزامات لگا کر اپنی 'ادبی بے ہودگی' کا ثبوت دیا ہے۔'' (محولہ بالا: ص ۴۹)

(xxiii) ''اگر آج جھوٹوں کا بین الاقوامی مقابلہ ہوتا تو شاید نہیں، یقیناً اس مقابلے میں اول آزاد آتے۔'' (ایضاً)

(xxiv)''حقیقت یہ ہے کہ قاسم اور آزاد نے اردو تحقیق کے ساتھ زبردست غداری کی ہے اور نکات اور میر پر بے بنیاد الزامات لگا کر اپنی ادبی بیہودگی کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے اپنے ان سخت الفاظ کے لیے معافی مانگنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ آزاد وغیرہ تو میر کو گالیاں سنا چکے ہیں۔'' (مسعود حسن رضوی کا خط۔ اردو نامہ، کراچی: شمارہ۔۱۵ جنوری مارچ ۱۹۶۴ء:ص۷۹و۸۰)

(xxv)''آزاد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے ہر شاعر پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد کر دیتے ہیں۔'' (جسے حامد حسن قادری نے چٹکی لینا کہا ہے۔) (ذوق اور محمد حسین آزاد: ڈاکٹر عابد پیشاوری: ادارہ فکرِ جدید، نئی دہلی: ۱۹۸۷ء:ص۶)

(xxvi)''عملاً انھوں (آزاد) نے ہر بزرگ پر حرف رکھا ہے، لیکن اپنے کمالِ بیان سے محسوس نہیں ہونے دیا۔'' (محولہ بالا:ص۷)

(xxvii)''اس داستان کے پہلے حصے کے خط کشیدہ جملے آب کی طبع اول میں نہیں تھے۔'' (محولہ بالا:ص۱۲)

(xxviii)''آزاد نے دوسرے جملے سے قارئین کو گمراہ کرنے کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (محولہ بالا:ص۱۶)

(xxix)''غالباً آزاد کی طبیعت معروف کو ذوق کا شاگرد ثابت کرنے کے باوجود نہیں بھری، چنانچہ انھوں نے ان کے واقعی استاد شاہ نصیر کے علاوہ بھی کئی لوگوں کو ان کا استاد بنا ڈالا اور تسبیح زمرد کے سلسلے میں دریوزہ گر بھی۔'' (محولہ بالا:ص۲۰)

(xxx)''آزاد نے غدر میں گھر سے نکلنے کی، جو دردناک کہانی بیان کی ہے، وہ بھی محض افسانہ ہے۔'' (محولہ بالا:ص۱۵۹)

(xxxi)''کسی کا مضمون اُڑا لینا بھی ایک فن ہے۔ اس کے لیے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہے، جو آزاد کے حصے میں نہیں آیا۔'' (محولہ بالا:ص۲۱۲)

(xxxii)''آزاد نے میٹھی چھری سے حلال کیا ہے اور نعمت خاں عالی کی طرح تعصبات کے چھپانے میں زیادہ سلیقہ دکھایا ہے۔'' (میرزا غالب کا مذہب: سراج الحق: نگار: جون ۱۹۲۹ء:ص۲۶)

(xxxiii)''افسوس! نامور اور باکمال شعرائے اردو کو آبِ حیات سے کیا فائدہ پہنچا۔ جب سب لوگ چاروں طرف عجیب عجیب بدنمابیئت میں پڑے سسک رہے ہیں، ایسی زندگیِ جاوید سے تو ان کی گمنامی ہی اچھی تھی۔'' (محولہ بالا)

۵۔ مسعود حسن رضوی خط بنام مدیر اردو نامہ، کراچی: شمارہ ۱۵: جنوری مارچ ۱۹۶۴ء:ص۷۹و۸۰۔

مسعود حسن رضوی انھیں خیالات کا اظہار اپنی تصنیف فیضِ میر کے دیباچے میں ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''بعض ذی علم اور نام برآوردہ بزرگوں کی غیر تحقیقی تحریروں اور غیر محتاط رویوں سے متاثر ہو کر ایسے ایسے نوخیز لکھنے والے، جو علمی استعداد اور معلومات کی وسعت کے اعتبار سے آزاد کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچتے، اس محقق علام کے منہ آنے لگے اور اس پر اعتراض کر کر کے گویا چاند پر خاک ڈالنے لگے۔ ان سب اعتراضوں کا جائزہ لیا جائے تو آبِ حیات سے کہیں زیادہ ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔'' (آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ: مسعود حسن رضوی ادیب:ص۲۳)

۶۔ ایضاً۔ مسعود حسن رضوی ادیب فیضِ میر کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی ہے اور پھیلائی

جارہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا، جو ہماری دسترس سے دور، یا ہمارے علم سے باہر ہے، اس کو آزاد کا گھڑا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی تحقیق کو غلطیوں سے مفر نہیں، لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔" (فیضِ میر مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب: ص۲۲،۲۳ بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر طاہر تونسوی: ص۱۲۶)

۷۔ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی: فروری ۱۹۷۶ء: ص۲۲ بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر طاہر تونسوی: ص۱۲۸۔ مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا فاضل لکھنوی کو ۳۰ رجنوری ۱۹۵۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "یہ کتاب کا ہے کو ہے، ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے۔ اُمید ہے اس کے مطالعے سے آبِ حیات کا درجہ اور مصنف آبِ حیات کا پایہ متعین کرنے میں مدد ملے گی۔ آپ نے اس کتابچے کی تکمیل کو بڑا کام قرار دیا ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ اگرچہ یہ ایک مدت کے مطالعے کا نتیجہ ہے، پھر بھی کوئی بڑا کام نہیں سمجھا جاسکتا۔ ہاں! اگر اس سے ایک عظیم تصنیف کی تحقیر اور اس کے مصنف، اردو کے محسنِ اعظم کے ساتھ ناانصافی کا سدِباب ہوجائے تو اپنے نتیجے کے اعتبار سے اس کو شاید بڑا کام کہا جاسکے۔" (مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: ص۱۲۸)

۸۔ غالب: غلام رسول مہر: کوہِ نور پرنٹنگ پریس، لاہور: س۔ن: ص۳۹۰۔

۹۔ آبِ حیات: ابرار عبدالسلام (مرتب): شعبہء اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان: ۲۰۰۶ء: ص۵۶،۴۷۔

۱۰۔ مقالاتِ شیرانی جلد سوم: ص۴۲۔

۱۱۔ دیکھیے: مقالاتِ آزاد، جلد اول: آغا محمد باقر (مرتب): مجلس ترقیِ ادب، لاہور: ص۲۰۶۔

۱۲۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص۱۵۸۔

۱۳۔ دیکھیے: (i) آزاد بحیثیت محقق: ص۱۷۔

(ii) اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں: قاضی عبدالودود: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۵ء: ص۵۸۔

۱۴۔ تدوینِ دیوانِ ذوق مشمولہ آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین: ڈاکٹر محمد صادق: ص۱۷۴۔۳۰۴۔

۱۵۔ آبِ حیات میں آزاد کی اصلاحیں۔ ایک تحقیقی مطالعہ: ابرار عبدالسلام مشمولہ تحقیق: مجلّہ سندھ یونیورسٹی جامشورو: شمارہ ۱۶: ۲۰۰۸ء: ص۵۲۷۔۵۵۰۔

۱۶۔ اردو کی ادبی تاریخیں: ص۱۲۵۔

۱۷۔ ادبی اور لسانی تحقیق۔ اصول اور طریقِ کار، ترتیب: پروفیسر عبدالستار دلوی: شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی: دسمبر ۱۹۸۴ء: ص۱۲۳۔۱۲۴۔

۱۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مقدمہ دیوانِ مصحفی کا تقابلی مطالعہ، تخریج و تقدیم: محمد بدرالدین، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۶ء۔

۱۹۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر مرتبہ گوپی چند نارنگ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۱۹۹۰ء۔ گوپی چند نارنگ مقدمے میں لکھتے ہیں: ''امیر خسرو کا ہندوی کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے اور ان سات صدیوں میں وہ ہماری لوک روایت، یا لوک ساہتیہ کا حصہ بن گیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں زبانوں پر چڑھنے سے اس میں ترمیم و تصریف ضرور ہوئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ امیر خسرو سے منسوب کلام کے کچھ حصے اصلی ہوں، لیکن کئی حصے یقیناً ایسے بھی ہیں، جن کا بعد میں اضافہ ہوتا رہا، اس لیے ایسے کلام کا جائزہ لینے میں تاریخی اور لسانی دونوں طرح کی شہادتوں پر نظر رکھنی ہو گی۔'' (ص ۳۷)۔ مقدمے کے آخر میں لکھتے ہیں: ''اس میں شک نہیں کہ امیر خسرو کی مقبولیت کی وجہ سے ہندوی کلام کچھ نہ کچھ ضرور بدل گیا ہوگا اور اس میں الحاقی کلام کا بھی اضافہ ہوتا رہا ہوگا، مثلاً: چلم، بندوق، حقہ، روپیہ، دیا سلائی وغیرہ۔ متعدد پہیلیاں یقیناً الحاقی ہیں، لیکن اس تمام ہندوی سرمائے کو جو صدیوں سے روایتاً امیر خسرو سے منسوب رہا ہے، اگر یکسر قبول نہیں کیا جاسکتا تو اس کو بغیر کسی معقول وجہ کے یکسر رد کر دینا بھی انصاف کے خلاف ہے۔'' (ص ۶۹)۔ مسعود حسین خان کے خیال میں خسرو سے منسوب پہلیوں میں دس فیصد پہیلیاں ہی امیر خسرو کی ہوسکتی ہیں۔ (ص ۲۲۷)

۲۰۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۳۲۔

۲۱۔ آبِ حیات میں ترجمۂ غالب: کالی داس گپتا رضا: آج کل، نئی دہلی: فروری ۱۹۸۸ء: ص ۵۔

۲۲۔ غالب اور محمد حسین آزاد: کاظم علی خان: غالب نامہ، دہلی: جولائی ۱۹۸۹ء: ص ۲۲۲۔

۲۳۔ آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین: ڈاکٹر محمد صادق: مجلس ترقیِ ادب، لاہور: طبعِ دوم دسمبر ۲۰۱۰ء: ص ۲۶ و ۲۷۔

۲۴۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۳۲۔

۲۵۔ آبِ حیات میں ترجمۂ غالب: کالی داس گپتا رضا: ص ۵۔

۲۶۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۴۰۔

۲۷۔ آبِ حیات میں ترجمۂ غالب: کالی داس گپتا رضا: ص ۱۰۔

۲۸۔ آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین: ص ۲۶ و ۲۷۔

۲۹۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۳۳۔

۳۰۔ غالب اور آہنگِ غالب، یوسف حسین خان: غالب اکیڈمی، دہلی: اشاعتِ دوم ستمبر ۱۹۷۱ء: ص ۲۲۔

۳۱۔ آبِ حیات میں ترجمۂ غالب: کالی داس گپتا رضا: ص ۵۔

۳۲۔ غالب اور محمد حسین آزاد: کاظم علی خان: ص ۲۲۲ و ۲۲۳۔

۳۳۔ غالب کے خطوط، حصہ چہارم: خلیق انجم (مرتب): انجمن ترقیِ اردو، کراچی: اول ۱۹۹۵ء: ص ۱۵۳۳۔

۳۴۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۴۴۔

۳۵۔ آب حیات میں ترجمۂ غالب : کالی داس گپتا رضا: ص ۵۔

۳۶۔ غالب اور محمد حسین آزاد : کاظم علی خان: ص ۲۲۳۔

۳۷۔ غالب کے خطوط : خلیق انجم (مرتب): ص ۱۵۳۳ و ۱۵۳۴۔

۳۸۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۴۳۔

۳۹۔ غالب اور محمد حسین آزاد : کاظم علی خان: ص ۲۲۳۔

۴۰۔ دیوانِ ذوق : شیخ ابراہیم ذوق رمحمد حسین آزاد (مرتب): علیمی پرنٹنگ ورکس، دہلی: ۱۹۳۳ء: ص ۱۱۲ و ۱۱۳۔

۴۱۔ اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن : ڈاکٹر تنویر احمد علوی: سنگت پبلشرز، لاہور: ۲۰۰۶ء: ص ۹۸۔

۴۲۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۰۶۔

۴۳۔ مرزا محمد رفیع سودا : ص ۱۲۸۔

۴۴۔ امیر مینائی : شاہ محمد ممتاز علی آہ: ادبی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۱ء: ص ۱۰۴۔

۴۵۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۴۸ و ۳۴۹۔

۴۶۔(i) تدوینِ متن کے مسائل ، قاضی عبدالودود: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ص ۱۳۔

(ii) تذکرۂ شعراء : ابن امین اللہ طوفان رقاضی عبدالودود (مرتب): آزاد پریس سبزی باغ، پٹنہ: اپریل مئی ۱۹۵۴ء: ص ۲۹۔

۴۷۔ ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ : رشید حسن خاں: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ: ۲۰۰۵ء: ص ۱۲۱۔

۴۸۔ دیکھیے: آزاد کا دورِ جنون : ڈاکٹر گیان چند جین: قومی زبان ، کراچی: مئی ۱۹۹۱ء: ص ۲۳۔۳۳۔

۴۹۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۴۳۔

۵۰۔ بحولہ بالا: ص ۱۲۰۔

۵۱۔ نقد و انتقاد : سید اعجاز احمد معجز سہسوانی: ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ: اول ۱۹۶۰ء: ص ۳۱۔

۵۲۔ اردو کی کہانی : احتشام حسین: ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی: ۱۹۸۰ء: ص ۳۴۔

۵۳۔ دیوانِ مصحفی : اسیر لکھنوی و امیر مینائی (مرتبین): خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۰ء: ص ۴۱۔

۵۴۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۳۴ و ۱۳۵۔

۵۵۔ آزاد بحیثیت محقق : ص ۱۰۔

۵۶۔ دید و دریافت : نثار احمد فاروقی: آزاد کتاب گھر، دہلی: ۱۹۶۴ء: ص ۲۰۲۔

۵۷۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۹۳۔

۵۸۔(i) آزاد بحیثیت محقق : ص ۱۰۔

(ii) اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں : قاضی عبدالودود: ص ۷۰۔

۵۹۔ تذکرۂ ہندی : غلام ہمدانی مصحفی رمولوی عبدالحق (مرتب): جامع برقی پریس، دہلی: ۱۹۳۳ء: ص ۸۰۔

۶۰۔ ہفت تماشائے قتیل : مرزا محمد حسن قتیل: مطبعِ منشی نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۷۵ء: ص ۸۳۔

۶۱۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۳۰۔

۶۲۔ آزاد بحیثیت محقق : ص ۱۳۔

۶۳۔ دیکھیے: طبقاتِ سخن : مبتلا میرٹھی رڈاکٹر نسیم اقتدار علی (مرتب): مکتبۂ جامعہ، دہلی: ۱۹۹۱ء: ص ۱۵۔

۶۴۔ مرزا محمد رفیع سودا : ص ۴۷۵۔

۶۵۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۲۳۷۔

۶۶۔ آزاد بحیثیت محقق : ص ۱۲۔

۶۷۔ ایضاً۔

۶۸۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین : ص ۱۴ و ۱۵۔

۶۹۔ محولہ بالا: ص ۱۵۔

۷۰۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۰۹۔

۷۱۔ دیکھیے: مرزا محمد رفیع سودا : ص ۳۸۰-۳۸۲۔

۷۲۔ تحقیقاتِ حیدری : اکبر حیدری: نصرت پبلشرز، لکھنؤ: ۱۹۸۴ء: ص ۱۱۵۔

۷۳۔ مجمع الانتخاب : شاہ کمال مشمولہ تین تذکرے : ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (ملخص): مکتبۂ برہان اردو، دہلی: ص ۸۷۔

۷۴۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۱۴۔

۷۵۔ آزاد بحیثیت محقق : ص ۱۱۔

۷۶۔ طبقات الشعراء : قدرت اللہ شوق رنثار احمد فاروقی (مرتب): مجلس ترقیِ ادب، لاہور: جنوری ۱۹۶۸ء: ص ۵۳۰۔

۷۷۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۹۷۔

۷۸۔ محولہ بالا: ص ۵۳۹۔

۷۹۔ انشاء: فرحت اللہ بیگ: مکتبۂ جامعہ، دہلی: اگست ۱۹۴۳ء: ص ۵۸ و ۵۹۔

۸۰۔ سعادت یار خان رنگین۔ حیات اور نگارشات : حسن آرزو: مکتبہ رشیدیہ، یو، پی: ۱۹۸۴ء: ص ۱۳۲۔

۸۱۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۰۰۔

۸۲۔ محولہ بالا: ص ۵۲۵۔

۸۳۔ گلستانِ سخن : قادر بخش صابر رخلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب): مجلس ترقیِ ادب، لاہور: جون ۱۹۶۶ء: ص ۳۷۰۔

۸۴۔ دیوانِ معروف :نواب الٰہی بخش خاں معروف: نظامی پریس، بدایوں: ۱۹۳۵ء: ص ۲۲۰۔

۸۵۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۳۳۔

۸۶۔(i) غالب اور آہنگِ غالب :ص ۷۵۔

(ii) آبِ حیات میں ترجمۂ غالب :ص ۵۔

۸۷۔ غالب اور محمد حسین آزاد :کاظم علی خان: غالب نامہ ،دہلی: جولائی ۱۹۸۹ء: ص ۲۲۲۔

۸۸۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۳۴۴ و ۳۴۵۔

۸۹۔(i) دیوانِ غالب کامل مرتبہ کالی داس گپتا رضا: ص ۲۷۵ و ۲۷۶۔

(ii) آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۵۷۲۔

۹۰۔(i) اردوئے معلّٰی :مطبع مفید عام، آگرہ: ۱۹۱۴ء: ص ۲۰۴۔

(ii) عودِ ہندی اسمِ تاریخی مہرِ غالب مصنفہ غالب مرتبہ سرور: گلزار ہند سٹیم پریس، لاہور: س۔ن: ص ۱۰۸ و ۱۰۹۔

(iii) فنِ تنقید :اخلاق حسین عارف: غالب اکیڈمی، نئی دہلی: ۱۹۷۷ء: ص ۲۳۱۔

۸۵۔ آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام: ص ۱۶۱ و ۱۶۲۔

۹۱۔ میر بہادر علی وامق :نثار احمد فاروقی مشمولہ دراسات ،دہلی: دسمبر ۱۹۷۸ء: ص ۱۶۰۔۱۶۱ بحوالہ اردو کی ادبی تاریخیں :

ص ۶۲۔

۹۲۔ اردو کی ادبی تاریخیں :ص ۶۲۔

۹۳۔ ایضاً۔

۹۴۔ مجموعۂ نغز :قدرت اللہ قاسم رحافظ محمود شیرانی (مرتب): نیشنل اکاڈمی، دہلی: اکتوبر ۱۹۷۳ء۔

۹۵۔ مقالاتِ شیرانی ،جلد سوم: ص ۴۰ و ۴۱۔

۹۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے :

(i) یادگارِ غالب :الطاف حسین حالی: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی: ۱۹۹۶ء: ص ۴۲ و ۴۳۔

(ii) غالب کی غلط فہمیاں :اکبر حیدری کشمیری: ہماری زبان، نئی دہلی: یکم مئی ۱۹۹۶ء: ص ۸۔

۹۷۔ معاصر ۔۳۸: کلیم الدین احمد (مدیر): دائرہ ادب، پٹنہ: ص ۹۔

۹۸۔ حیاتِ شبلی :سید سلیمان ندوی: ص ۶۱۷۔

۹۹۔ افاداتِ مہدی :مہدی حسن رمہدی بیگم (مرتب): ص ۳۰۴۔

طارق علی شہزاد
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

نوازش لکھنوی۔عہد، سوانح اور کلام

Tariq Ali Shahzad
Ph.D Scholar,department of Urdu, AIOU, Islamabad

Abstract: The researcher has discussed about the life, period and literary services of Nawazish Lakhnavi. He has provided different examples while analyzing the poetry of Nawazish in a comrehensive way. Such examples are the reflection of Nawazish Lakhnavi and his contemporary poetic sense.

اورنگزیب عالمگیر (م ۱۷۰۷ء) کے عہد تک نہ صرف مغلیہ سلطنت اپنے عروج کی منزلیں طے کر رہی تھی، بلکہ ہند مسلم تہذیب بھی بامِ کمال کو جا پہنچی تھی۔ عالمگیر کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد مغلیہ سلطنت کی شان وشوکت تباہ و برباد ہو گئی اور مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت بھی مٹی میں مل گئی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے مطابق:

''عالمگیر کے بعد یہ ڈیڑھ سو برس گویا بیمار کے بھیانک اور ڈراؤنے خواب پریشان ہیں، جن میں فسادات، بدنظمی، انتشار اور ہر چیز اُلٹی سیدھی نظر آتی ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ ایک شمع تھی، جو بجھنے کے لیے آخری سانسیں لے رہی تھی۔''(۱)

یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ اودھ کی سیاسی خودمختاری کا آغاز نواب شجاع الدولہ سے ہوتا ہے۔ اودھ کے تہذیبی عروج کا آغاز نواب آصف الدولہ کے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کرنے سے ہوتا ہے، لیکن اودھ کی ادبی شان و شوکت کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے، جب مغلیہ سلطنت تباہ ہو جاتی ہے اور دِلّی اُجڑ جاتی ہے۔ رام بابو سکسینہ کے مطابق:

''دہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے اکثر اہلِ کمال نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور یہاں آ کر پناہ لی۔ دہلی کی شمعِ سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔''(۲)

یوں مسلمانوں کے ایک مرکز کی تباہی دوسرے مرکز کے عروج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ دِلّی سے مہاجر شعراء اودھ کا رُخ کرتے رہے اور نواب آصف الدولہ اُن کی سرپرستی کرتے رہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اِس ساری صورتِ حال کا خلاصہ بہت خوبصورتی سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''سلطنتِ مغلیہ کے آخری فرمانروا عیش وعشرت کے دِلدادہ اور کیف و سرور کے متوالے تھے۔ امورِ سلطنت سے زیادہ اُن کی دلچسپیاں بزمِ ناؤنوش اور محافلِ نغمہ وطرب سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ اِن حالات میں بیرونی طاقتوں کو حملہ آور ہونے کا موقع ملا۔ اکثر صوبے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بغاوت پر اُتر

آئے۔ طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کی فضا نے دہلی کی تہذیب و معاشرت پر نہایت منفی اثرات مرتب
کیے۔ خوف و خطر نے لوگوں کو دہلی سے ہجرت پر مجبور کر دیا۔ سلطنت کے دامنِ دولت سے وابستہ شعراء
مفلوک الحالی کا شکار ہوئے تو ایسے علاقوں کا رُخ کرنے لگے، جہاں شعر و ادب کے قدر دان اور مربی
موجود تھے۔ میر اور سودا جیسے عظیم اساتذۂ فن کو دہلی سے نکلنا پڑا اور ان کا آخری دور کربنا کی اور پریشانی
میں بسر ہوا۔ لکھنؤ نے شعر و ادب کی قدر دانی کے باعث شعراء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسی طرح دہلی کی
بربادی لکھنؤ کی آبادی کا باعث بن گئی۔ مصحفی، انشاء اور جرأت اگرچہ دہلی دبستان کے پروردہ تھے، مگر لکھنؤ
میں انھوں نے ایک نئے دبستانِ شعر کی داغ بیل ڈالی، جسے بعد میں ناسخ اور آتش نے تقویت دے کر
دبستانِ دہلی کے مقابل لا کھڑا کیا۔'' (۳)

دِلّی کی تباہی کے بعد اودھ کی سلطنت ایک ایسی مسلم ریاست کا درجہ اختیار کر چکی تھی، جو ایک طرف اُس پُر
آشوب دور میں مسلمانوں کی حفاظت کیے ہوئے تھی تو دوسری طرف اُس نے شاعری اور ادب میں بھی ایک نئے دبستان کی
بنیاد رکھی، جسے 'لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس دبستان کو قائم کرنے والے بھی دہلی کے شعراء ہی تھے۔
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے میں:

''فیض آباد اور لکھنؤ کی شاعری ہماری زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دِلّی کی تباہی کے بعد یہی
دو مقامات شرفائے ادب اور اربابِ فضل و کمال کا ماویٰ و ملجا رہے۔ اِس سرزمین میں شاعری کی طرح اِنھی
مہاجرین نے ڈالی اور جب تک یہ زندہ رہے، بازارِ شعر میں اِنھی کا سکہ چلتا رہا۔'' (۴)

یوں تو زبان کی اِصلاح کے حوالے سے لکھنؤ میں بہت کام ہوا، لیکن سب سے زیادہ خدمات ناسخ نے انجام دی
ہیں۔ اُنھوں نے زبان کی اِصلاح کی، اِس میں ثقیل اور پرانے الفاظ کی جگہ نئے الفاظ داخل کیے اور اِس زبان کو جدت
بخشی۔ ناسخ سے پہلے زبان اور غزل دونوں کو ریختہ کہا جاتا تھا۔ ناسخ نے اِن کے لیے اُردو اور غزل کے الفاظ استعمال کیے۔
اِس کے علاوہ اُنھوں نے تذکیر و تانیث کے قواعد مرتب کیے اور اِس کے ساتھ ساتھ ردیف اور قوافی کے اصول بھی ترتیب
دیے۔ بقولِ امداد امام اثر:

'اگر جنابِ شیخ کو اصلاحِ زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبانِ حال کی صورت پیدا نہ ہوتی۔'' (۵)

لکھنؤ میں مہاجر شعراء کی آمد تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھی۔ اِن شعراء نے اپنی خوشبو سے سارے لکھنؤ کو مہکا
دیا۔ زبان و ادب کے گلستان میں بھی کئی نئے پھول کھلے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کی زبان کو بھی مستند تسلیم کیا جانے لگا، جس کا
اعتراف الطاف حسین حالی نے بھی اِن الفاظ میں کیا ہے:

''۔۔۔لکھنؤ کی زبان کو اِس واسطے مستند مانا جاتا ہے کہ ابتداء سے شرفائے دہلی کے بے شمار خاندان ایک

مدتِ دراز تک لکھنؤ میں جاجا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیے وہیں رہ پڑے۔ پس ہندوستان کے کسی شہر کو اہلِ دہلی سے اِس قدر میل جول کا موقع نہیں ملا، جس قدر کہ لکھنؤ کو ملا ہے۔'' (۶)

لکھنؤ میں زبان کے حوالے سے بہت عمدہ کام کیا گیا۔ زبان کی اِصلاح کی گئی؛ نئی نئی تحریکات سامنے آئیں اور اِس کا نتیجہ اُردو زبان کے عروج کی صورت میں برآمد ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق:

''لکھنؤ نے زبان کی اصلاح، تعین اور صفائی کی بہت اچھی کوشش کی۔ خود دہلی والے آخرِ کار لکھنؤ کی تقلید کرنے لگے اور وہاں نئی نئی تحریکات اور مفید اصلاحات معلوم کرنے کے لیے چشم براہ رہتے تھے۔ لکھنؤ کی ہی اِس عظیم الشان خدمت کا نتیجہ تھا کہ وسطِ انیسویں صدی عیسوی میں اُردو معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔'' (۷)

رام بابو سکسینہ نے اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لکھنؤ کی زبان دہلی کی زبان سے بہتر ہے:

''لکھنؤ کی زبان یقیناً دہلی کی زبان سے زیادہ شائستہ، مہذب اور نرم و نازک ہے، مگر یہ شائستگی، تہذیب اور نزاکت ایک بڑی قیمت پر حاصل کی گئی ہے اور بہت مہنگی پڑی ہے۔'' (۸)

اگر ہم اس عہد کی تہذیب کو دیکھیں تو ہمیں اس پر ایرانی رنگ اور عقیدہ غالب نظر آتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کے مطابق:

''دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سُنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے، جس قدر وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا اور یہاں کا حکمران خاندان خاص ایران سے آیا تھا، اس لیے یہاں ایرانی بالکل کُھل گئے اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے، وہ جس قدر شگفتہ ہوئے، اسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہلِ دربار نے ان کے اوضاع و اطوار کو اختیار کرنا شروع کیا اور ایرانیت، جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کی آغوش میں پلی تھی، چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔'' (۹)

لکھنؤ میں نوابانِ اودھ کا دور ایرانی تہذیب کے عروج کا دور ہے۔ ایرانیوں کا اثر و رسوخ ہندوستان کی سلطنت میں اُس وقت ہی بڑھنا شروع ہو گیا تھا، جب مغل شہنشاہ ہمایوں نے ایرانی فوج کی مدد سے ہندوستان کو فتح کیا تھا۔ شاہِ ایران سے ہمایوں نے جو معاہدہ کیا تھا، اُس میں قندھار کو ایرانیوں کے حوالے کرنا، شیعہ مذہب کو اختیار کرنا اور ایرانیوں کو سلطنت میں کلیدی عہدوں پر فائز کرنا شامل تھا۔ اگرچہ ہمایوں نے اِن شرائط میں سے صرف آخر الذکر کو پورا کیا اور بیرم خان سمیت تمام شیعہ امراء کو بڑے بڑے عہدے دیے، مگر اِس سے ہندوستان میں ایرانی تہذیب و تمدن کے عروج کا دور شروع ہو گیا۔ اودھ کی سلطنت کے بانی نواب سعادت علی خاں برہان الملک کا تعلق ایران کے شہر نیشاپور سے تھا۔ اودھ کا حکمران بننے سے پہلے، وہ مغلیہ دربار میں ایرانی گروہ کی سربراہی کرتا تھا اور اودھ کا حکمران بننے کے بعد اُس نے اودھ کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔ یوں ہمیں اُس عہد کی تہذیب پر ایرانی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شعراء دوسرے

شہروں سے آئے تھے، اُن کو بھی اِسی رنگ میں رنگنا پڑا، جو نہ رنگ سکے، اُن کو واپس جانا پڑا، یا آگے روانہ ہونا پڑا۔

اُس عہد کی تہذیب کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں پتا چلتا ہے کہ اُس دور کا لکھنؤ شدید مذہبی رجحانات رکھتا تھا۔ نوابانِ اودھ شیعہ تھے اور اُن کی سرپرستی سے اودھ اور لکھنؤ میں شیعیت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ رام بابو سکسینہ کے مطابق:

"لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہلِ تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔" (۱۰)

مغل سلطنت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی، جس میں درجنوں مذاہب کے ماننے والے موجود تھے، اِس لیے وہاں کے حکمرانوں کو علانیہ کسی پر کوئی مذہب تھوپنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ اورنگزیب عالمگیر کے مذہبی اقدامات کو بھی شک کی نظر سے دیکھا گیا اور اُس کے عہد میں بہت سی بغاوتیں مذہبی بنیادوں پر برپا کی گئیں۔ والیانِ اودھ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔ وہ ایرانی النسل اور شیعہ مذہب کے پیروکار تھے۔ اُنھوں نے علانیہ اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور درجنوں امام باڑے تعمیر کروائے۔ یہاں تک کہ شیعیت کو اودھ کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق:

"لکھنوی تہذیب و معاشرت کی در و بست میں والیانِ اودھ کے مذہبی عقائد کو بڑا دخل تھا۔ سلطنتِ اودھ کے بانی ایرانی نژاد تھے اور مذہب کے اعتبار سے اثنا عشری عقیدے کے تحت سے پیروکار تھے۔ اُن کے جانشینوں نے اپنے عہد میں اِن مذہبی معتقدات میں بڑے غلو سے کام لیا، حتیٰ کہ اثنا عشری عقیدہ سلطنتِ اودھ کا سرکاری مذہب بن گیا۔" (۱۱)

اِس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُس عہد کا معاشرہ اِسی رنگ میں رنگا گیا۔ محرم کے دس دن ماتمی جلوس نکالے جاتے اور مجالس کا اہتمام کیا جاتا۔ نذر، نیاز، ماتم اور عزاداری وغیرہ معاشرے کا لازمی حصہ بن گئے۔ بعد میں حضرت امام حسینؓ کا ماتم محرم کی دس، یا بارہ تاریخ تک محدود رکھنے کی بجائے چہلم تک بڑھا دیا گیا۔ اِن چالیس دنوں میں کوئی خوشی کی تقریب منعقد نہ کی جاتی۔ شاہی محلات میں مجالسِ ماتم منعقد کی جاتیں، جن میں نوابان اور ان کے اہلِ خانہ شرکت کرتے۔ بعض دفعہ یہ لوگ اپنے سر میں خاک ڈال لیتے اور خود کو زنجیروں میں جکڑ لیتے تھے۔ اِس دوران میں کوئی امورِ سلطنت بھی انجام نہ دیا جاتا تھا۔

ادبی لحاظ سے بھی یہ دور بہت اہم تھا۔ لکھنؤ کی سرزمین مرثیہ خوانی کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ سرکاری مذہب اثنا عشری ہونے کی وجہ سے مرثیہ کی صنف اور مرثیہ خوانی دونوں کی شاہی سرپرستی کی گئی، جس کی وجہ سے اس دور میں لکھنؤ میں مرثیے کو فروغ حاصل ہوا۔ میر حسن، میر ضمیر، میر خلیق، میر انیس، مرزا دبیر، میاں دلگیر اور درجنوں دیگر مرثیہ خواں پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف مرثیہ گوئی، بلکہ مرثیہ خوانی میں بھی نام پیدا کیا۔ مرثیہ کے عروج نے غزل پر بھی اثر کو زوال ڈالا۔ اِس میں سے تصوف، داخلیت اور جذبات و احساسات خارج ہو گئے اور اِس کی جگہ خارجیت اور معاملہ بندی نے

لے لی۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق:

''اثنا عشری عقیدے کی پیروی نے، جہاں ایک طرف مرثیہ جیسا اہم اخلاقی شاعری کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا، وہاں دوسری طرف غزل کو تحت الثریٰ میں پھینک دیا۔'' (۱۲)

اُس عہد میں مرثیہ کو جو عروج حاصل ہوا، ویسا عروج آج تک کبھی حاصل نہ ہو سکا۔انیس اور دبیر نے مرثیہ کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔لکھنؤ میں یہ دور عیش و عشرت اور فارغ البالی کا دور تھا۔ ہر طرف آسودگی تھی۔حکمران بھی عیش و عشرت کے رسیا تھے اور عوام بھی ہوس اور عیش و نشاط کے عادی۔ ہر طرف رنگ رلیاں اور بدمستیاں تھیں۔اس صورتِ حال کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''۔۔۔سیر و شکار، جانوروں کی لڑائیاں، بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی، کبوتروں کی پالیاں، رقص و موسیقی، ناٹک رہس وغیرہ ایسے اشغال تھے، جو اودھ کے حکمرانوں، اُن کے حاشیہ برداروں اور عام رعایا کو بہت مرغوب تھے۔غرض یہ ایک ایسا حمام تھا، جس میں سب ننگے ہو گئے تھے۔ یہاں کے شعر و ادب کا بیشتر سرمایہ بھی اس عیش پرستانہ میلان کا آئینہ دار ہے۔'' (۱۳)

یوں تو ہر حکمران نے یہ طوفانِ عیش و عشرت برپا کرنے میں دامے، درمے، سخنے اور قدمے اپنا حصہ ڈالا لیکن نواب واجد علی شاہ کے نے تو ہر حد پار کر لی۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کے مطابق:

''پورا لکھنؤ ایک عورت تھا، جس کے پیا جانِ عالم واجد علی شاہ تھے۔'' (۱۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی اس بات کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''رنگیلے پیا جانِ عالم کا عہد رقص و سرود و عیش و نشاط کا عہد تھا۔اُن کے دور میں اہلِ لکھنؤ پر زندگی فی الواقع سہل رہی ہو، یا نہ رہی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے عہد میں لوگ بابر به عیش کوش که عالم دوباره نیست پر حسبِ مقدور عامل تھے۔'' (۱۵)

واجد علی شاہ علم و ادب کے میدان کا تماشائی نہیں، بلکہ کھلاڑی تھا۔اُس کے ذوق کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے پرندوں تک کے محبوبانہ نام رکھے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ایک فاختہ کے ۴۱ نام رکھے ہوئے تھے۔اس کو فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ پر عبور حاصل تھا۔ایک دفعہ اپنے بارے میں کہا:

''اگر پیروں میں گھنگھرو باندھ کر، ناچوں تو جس گھنگھرو کو حکم دوں گا، صرف وہی آواز کرے گا۔'' (۱۶)

تاہم واجد علی شاہ کے اقبال کا سورج ڈوبتے ہی لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کا سورج بھی ڈوب گیا اور اب اس کی صرف یادیں باقی ہیں، جو مختلف کتب میں بکھری پڑی ہیں۔اس عہد میں عورت نہ صرف گھر میں آزاد اور خود مختار تھی، بلکہ طوائف کی صورت میں عورت کے ایک نئے روپ نے جنم لیا، جو ایک طرف آزاد خیالی اور روشن خیالی کی مظہر تھی تو دوسری

طرف ادب وسخن کی نمائندہ بھی تھی۔ اُس کی صحبت میں بیٹھنا نوابین اور شرفاء باعثِ سعادت خیال کرتے تھے:

''لکھنؤ کی تہذیب میں عورت آسانی سے حاصل ہو جاتی تھی اور یہی نہیں، مردوں کی زندگی میں ضرورت سے زیادہ دخیل اور اثر انداز ہو گئی تھی۔'' (۱۷)

نورالحسن جعفری کے بقول:

''جب دہلی اُجڑی اور لکھنؤ میں شعروسخن کی محفل آراستہ ہوئی تو یہ لکھنؤ کی فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ اہلِ لکھنؤ کے حوصلے بلند تھے اور وہ ہر معاملے میں دہلی کے اثر سے آزاد ہونا اور دہلی پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ شعروشاعری کے سلسلے میں بھی وہ روشِ دہلی سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے۔ لکھنؤ کے عیش پرستانہ ماحول نے ایک نیا موضوع اور ایک نیا اندازِ بیاں مہیا کر دیا۔ نسوانی حسن کی تصویر کشی سے زیادہ سامنے کا موضوع ان کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا؟ عریاں جنسی معاملات کو انھوں نے شعر کا موضوع بنا دیا۔ وہ ہجر کی حرماں نصیبی سے ناواقف اور لذتِ وصال سے آشنا تھے۔ چنانچہ یہی اُن کا موضوع ٹھہرا۔ صلے اور ستائش دونوں کی کمی نہیں تھی۔'' (۱۸)

اس ہوس پرستی اور بے راہ روی کا نتیجہ لکھنوی شاعری میں ابتذال کی صورت میں برآمد ہوا:

''یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ متعدد لکھنوی غزل گویوں اور مثنوی نگاروں کے یہاں ابتذال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔'' (۱۹)

اِسی چیز کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اردو غزل پر لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کا جو اثر پڑا، اُس کی نمایاں شکل معاملہ بندی ہے، جس کی حدیں تصوف کی عدم موجودگی میں ہوسناکی سے جاملیں اور لکھنوی غزل میں رکاکت اور ابتذال کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔'' (۲۰)

اِس کی ابتداء معاملہ بندی کے نام پر جرأت نے کی۔ ابواللیث صدیقی کی رائے میں:

''معاملہ بندی کی ابتداء جرأت سے ہوئی اور اس کے بعد یہ ایک روایت سی بن گئی اور تقریباً تمام لکھنوی شعراء اسی رنگ میں رنگے گئے۔'' (۲۱)

ابتداء کسی نے بھی کی ہو، انتہا کرنے میں کم وبیش تمام شعراء نے حصہ لیا تھا:

''اردو شاعری کے کسی دور میں بھی مبتذل خیالات اور مبتذل بیان کی ایسی مثالیں نہیں ملیں گی جیسی لکھنؤ کے شعرائے متقدمین کے کلام میں موجود ہیں، جو گندگی اُس عہد کی معاشرت میں پائی گئی تھی، وہی اس دور کے کلام میں جھلکتی ہے۔ اس میں ہر شاعر شریک ہے۔ البتہ بعض کے یہاں یہ رنگ بہت گہرا اور بعض کے یہاں نسبتاً ہلکا ہے۔'' (۲۲)

اِس کے علاوہ اُس دور کی شاعری کی نمایاں خصوصیت لفاظی ،صنعت گری ،فصاحت و بلاغت اور شوکتِ لفظی ہے۔اُس دور میں مسجع اور رنگین زبان کو ہی معیار سمجھا جاتا تھا۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے خیال میں:

''انیسویں صدی میں 'صنعت' کو فطرت پر ترجیح دینے کا عام رواج تھا۔اُس عہد کے لکھنؤ میں زندگی کے ہر شعبے میں کمالِ صنعت کی داد دی جارہی تھی۔نثر اور نظم دونوں کو تکلفات سے آراستہ کیا جارہا تھا۔یہی سبب ہے کہ لکھنؤ کی شاعری لفظی صناعی اور صنعت گری کا نمونہ بن گئی۔'' (۲۳)

رعایتِ لفظی کے بارے میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی رائے کچھ یوں ہے:

''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اپنی رعایتِ لفظی کی وجہ سے بدنام ہے۔'' (۲۴)

رام بابو سکسینہ کے خیال میں بھی زبان کی رنگینی کو ہی فن اور حسن سمجھا جاتا تھا:

''فن میں بھی جس چیز کو حسن سمجھا گیا ہے، وہ حسن نہیں ،تکلف ،یا آورد ہے۔فصاحت و بلاغت کا معیار، صنعتوں کا التزام،تشبیہات و استعارات کا ذوق ،دراصل اس عورت کی یاد دلاتا ہے، جو زیور کی شوقین ہے، اپنا حسن کم رکھتی ہے۔'' (۲۵)

لکھنوی تہذیب و ادب کا ایک بڑا تحفہ 'ریختی' ہے۔اِس صنف نے لکھنؤ میں بہت زیادہ عروج حاصل کیا۔ریختی سے مراد ریختہ کی تانیث ہے، جس میں عورتوں کے جذبات و احساسات اُنھیں کی زبان سے بیان کیے جاتے ہیں۔اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے۔ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے مطابق:

''ریختی کا آغاز اگرچہ دکن میں ہو چکا تھا،مگر اسے رنگین نے اردو کی باقاعدہ صنف بنایا۔ان کے تلامذہ کے حلقے میں ریختی گو خواتین بھی شامل تھیں۔'' (۲۶)

انشاء بھی ریختی گو تھے۔اُنھوں نے ریختی میں ایک دیوان لکھا ہے۔رنگین کے علاوہ جان صاحب بھی ریختی گو شاعر تھے۔ان دونوں کے علاوہ بھی شعراء نے ریختی کہی ،لیکن اُن کو وہ عروج حاصل نہ ہوا، جو رنگین ،انشاء اور جان صاحب کو نصیب ہوا۔ریختی کی صنف اگرچہ دلچسپ تھی اور اِس سے اُس دور کے بہت سے حالات کی تفصیل ملتی ہے،مگر اس کے باوجود اِسے غیر مہذب مانا جاتا ہے۔شرر کے مطابق:

''ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاک دامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابلِ ترقی ہوتا ،مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات سے پُر تھی، اس لیے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا،مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔'' (۲۷)

اس عہد میں ایک اور صنف نے بہت زیادہ عروج حاصل کیا۔ یہ صنف مثنوی ہے۔اُس عہد کے لکھنؤ کی فضا

مثنوی کے لیے بہت ساز گار تھی۔ ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی تھی۔ اس عہد میں بہت سی شاہکار مثنویاں سامنے آئیں، جن میں میر حسن کی سحر البیان، دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم، قلق کی طلسمِ الفت اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں زہرِ عشق اور بہارِ عشق وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُس عہد کی معاشرت کے پیشِ نظر سب مثنویوں کا موضوع عشق ہے۔ جذبات کی بھرمار، تعیش پرستی، نازک مزاجی، ہوس وحرص، سازشیں اور نفس پرستی کے واضح نمونے اِن مثنویوں میں موجود ہیں، جو اُس دور میں عام تھے۔ نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اُس دور کی معاشرت اُس عہد میں لکھے گئے ادب میں کس حد تک سرایت کر چکی تھی۔ اِسی طرح میر حسن کی مثنویوں میں بھی ہمیں لکھنؤ بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے مطابق:

> ''میر حسن کی مثنویاں اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔ دربار، محلات، تقریبات، جشن وجلوس سب پر اودھ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ سحر البیان کا قصہ اگرچہ دوسرے ملک سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اِس کی فضا اودھ کی ہے اور اِن مثنویوں میں اُن کے عہد کے اودھ کا معاشرتی خاکہ بھی نظر آتا ہے۔ بعض ایسے پہلو اُنھوں نے پیش کیے ہیں کہ اودھ کے تاریخ نگاروں نے اِنھیں مثنویوں کو اپنا مآخذ بنایا ہے۔'' (۲۸)

لکھنوی عہد کا ایک اور قابلِ ذکر تحفہ ڈرامے کی صنف کا عروج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برِ صغیر میں یہ فن یورپین لائے۔ لکھنؤ میں فرانسیسیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر مبنی ڈرامے پیش کیے، جس سے لکھنؤ میں رہس کے نام سے اِس صنف کا آغاز ہوا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں بہت سے فرانسیسی موجود تھے، جن کی مدد سے ہندوستانی ناٹک اور یورپین اوپیرا کو ملا کر رہس تیار کیے گئے۔ سب سے پہلا رہس اِندر سبھا کو مانا جاتا ہے۔ یہ تحریر امانت لکھنوی کی تھی۔ تاہم اِس کی ہدایات، مکالمہ نویسی اور پیشکش واجد علی شاہ کی تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس میں راجہ اِندر کا کردار واجد علی شاہ نے ادا کیا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق: اندر سبھا کو ڈرامہ کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ اِس میں ڈرامے کے پورے لوازمات موجود نہیں تھے۔ ابواللیث صدیقی کے خیال میں:

> ''ڈرامے کے فنی نقطۂ نظر سے اِندر سبھا مشکل سے ہی ڈرامہ کہی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس میں ساری کہانی عمل اور کرداروں کے ذریعے ادا ہوئی ہے اور یہ کردار بھی دراصل کاٹھ کی پُتلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حرکت کرتے ہیں؛ اِن کا لباس الگ الگ ہے، لیکن اس لباس میں کسی کردار کی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ اس کا کوئی واضح اور مرتب پلاٹ نہیں؛ نہ اس میں آغاز، انجام اور نقطۂ عروج کی منزلیں آتی ہیں؛ نہ اس میں suspense پیدا ہوتا ہے، لیکن اِن تمام خامیوں کے باوجود یہی اردو ڈرامے کا نقشِ اوّل ہے۔'' (۲۹)

دربار میں پیش کیے جانے والے اِن رہس کی خبریں عوام تک بھی پہنچیں تو گلی گلی رہس ہونے لگے۔ یوں لکھنؤ

میں ڈرامے نے ایک باقاعدہ صنف کی شکل اختیار کر لی۔ شروع شروع میں تاریخی، یا مذہبی واقعات کو ہی ڈرامے کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا، مگر آہستہ آہستہ مختلف کہانیوں کو سٹیج پر پیش کیا جانے لگا۔ امانت کی اِندر سبھا کی کامیابی کے بعد بہت سی سبھائیں پیش کی گئیں۔ واجد علی شاہ سلطنت چھن جانے کے بعد مٹیا برج میں بھی رہس تیار اور پیش کرتے رہے، بلکہ انھوں نے مٹیا برج میں ایک خاص عمارت بھی تعمیر کروائی، جہاں اس طرح کے رہس ہوتے تھے۔ یوں بعد میں اس صنف میں جتنی بھی ترقی ہوئی ہو اور جتنے بھی بڑے بڑے نام اور کام سامنے آئے ہوں۔ ہم اِس صنف میں لکھنؤ کی سبقت اور خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سلاطینِ اودھ کے عہد میں تہذیب و تمدن نے بہت عروج حاصل کیا، مگر یہ عروج اتنا ہی عارضی اور کھوکھلا تھا، جتنا عارضی اور کھوکھلا سلاطینِ اودھ کا اقتدار تھا۔ برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر باقی تمام مدت نوابانِ اودھ انگریزی سنگینوں کے سائے میں عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہے۔ ان حکمرانوں کے دل میں عوام کے لیے درد تو موجود تھا، مگر عملی اقدامات کرنے سے وہ کبھی اپنی عیش و عشرت کے سبب اور کبھی سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے گریزاں رہے۔ عوام بھی اپنے حکمرانوں کی روش پر چل پڑے اور اس عہد میں لکھنوی معاشرے میں، جو طوفانِ بدتمیزی برپا ہوا، اس کی تفصیلات اس عہد کی تقریباً تمام کتب میں بھری پڑی ہیں۔ 'بابر بہ عیش کوش ---' پر عوام اور حکمران یکساں عمل پیرا تھے، تاہم جلد ہی یہ سہانا سپنا ٹوٹ گیا۔ انگریزوں نے اودھ کو سیاسی لحاظ سے ہی زیرِ نگیں نہیں کیا، بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کو بھی برباد کر دیا۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی، جب جنگِ آزادی میں اودھ کے مسلمانوں نے انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کی آخری کوشش کی، لیکن اس جنگ میں شکست نے اُن کی بربادی میں بچی ہوئی باقی کسر بھی پوری کر دی۔ انگریزوں نے جنگِ آزادی کا بدلہ پورے اودھ کو برباد کر کے لیا۔ یوں مسلم تمدن کی یہ آخری نشانی بھی مٹی میں مل گئی اور اِس کی جھلک آج ہمیں صرف رتن ناتھ سرشار کے ناول فسانۂ آزاد کے مزاحیہ کردار 'خوجی' کی 'نہ ہوئی قرولی ورنہ۔۔' کی صورت میں نوحہ خوانی کرتی دکھائی دیتی ہے، یا اُن تاریخی عمارات کی صورت میں جو لکھنؤ میں جگہ جگہ موجود ہیں، یا ایک اور نشانی اس ادب کی صورت میں موجود ہے، جو اس عہد میں لکھنؤ کے مقامی اور مہاجر شعراء نے تخلیق کیا تھا۔

نوازش لکھنوی۔ سوانح:

نام، تخلص، عرفیت:

نام نوازش حسین خاں تھا۔ بعض جگہ پر مرزا نوازش حسین خاں بھی ملتا ہے۔ تخلص نوازش، جبکہ عرف مرزا خانی تھا۔ سعادت خان ناصر کے مطابق:

''خدیو ملک سخن رانی، نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی شخصِ با تجمل، خلف الصدق حسین علی خاں ابنِ نواب ناصر خاں، صوبہ دار کابل، تخلص نوازش۔ شاعری کو اس پر نازش۔ شاگرد، بلکہ قائم مقامِ میر سوز۔'' (۳۰)

مولانا حسرت موہانی کے مطابق:

''نوازش تخلص، نوازش حسین خاں لکھنوی عرف مرزا خانی خلف حسین علی خاں بن نواب ناصر خاں، شاگردِ میر سوز۔ صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔'' (۳۱)

اس کے علاوہ نوازش مرزا جانی کی عرفیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ اپنے ایک شعر میں اُنھوں نے خود کو مرزا جانی کہا ہے:

اِس پتے سے گر مجھ کو پوچھو گے تو پاؤ گے
نام تو نوازش ہے، عُرف مرزا جانی ہے

خوب چند ذکاء نے بھی عیار الشعراء میں مرزا جانی لکھا ہے:

''نوازش خاں معروف بہ مرزا جانی المتخلص بہ نوازش نبیرۂ نواب ناصر خاں بہادر، شاگردِ میر سوز۔'' (۳۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی طبقاتِ سخن کے نسخۂ برلن کے حوالے سے مرزا جانی عرف بیان کیا ہے:

''طبقاتِ سخن (۱۲۲۱ھ/۸۔۷۔۱۸۰۷) میں واضح طور پر مرزا جانی لکھا ہے، اِسی لیے ہم نے بھی مرزا خانی کی بجائے مرزا جانی لکھا ہے''۔ (۳۳)

خاندان:

نوازش اور اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق کس قوم سے تھا؟ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ اس بارے میں ہمیں صرف دو حوالے ملتے ہیں:

پہلا حوالہ مصحفی کے تذکرہ ریاض الفصحاء کا ہے، جن کے مطابق نوازش چگتی، یا چغتائی مغل تھے:

''نوازش حسین خاں، نوازش تخلص عرف مرزا خانی ولد حسین علی خاں ابنِ نواب ناصر خاں صوبہ دارِ کابل و پشاور و غزنی، قوم مغل چگتی وطن بزرگانش ...خود در اکبر آباد تولد شدہ و در لکھنؤ نشوونما یافتہ ..'' (۳۴)

دوسری رائے محمد افضل رضا نے اپنی کتاب اردو کے قدیم پشتون شعراء میں ظاہر کی ہے کہ نوازش پشتون، یا پٹھان تھے۔ (۳۵) نوازش کے والد کا نام نواب حسین علی خاں تھا، جبکہ اُن کی والدہ بنگال کے نواب قاسم علی خاں عالی جاہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے دادا کا نام نواب ناصر خاں تھا۔ نواب ناصر خاں مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کی طرف سے کابل

کے صوبہ دار تھے۔۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ کابل میں نواب ناصر خاں نے اُس کا راستہ روکا اور محمد شاہ رنگیلا کو مدد کے واسطے لکھا۔ عیش وعشرت میں مست محمد شاہ رنگیلا نے کوئی توجہ نہ کی۔ نادر شاہ کے مقابلے میں نواب ناصر خاں کے پاس لشکر اور سامانِ حرب نہ ہونے کے برابر تھا۔ مقابلے کی تاب نہ لاکر ناصر خاں ہندوستان چلے آئے اور فرخ آباد (روہیلکھنڈ) میں آ کر قیام کیا۔ نوازش کے نانا نواب قاسم علی خاں عالی جاہ نے بنگال میں نواب سراج الدولہ کی شہادت کے بعد انگریزوں کے خلاف دوسری بڑی جنگ لڑی، جو 'بکسر کی جنگ' کہلاتی ہے۔ اُنھوں نے مغل بادشاہ شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ کی امداد حاصل کر کے بکسر کے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ نواب ناصر خاں اِس جنگ میں نواب قاسم علی خان کے ساتھ شامل تھے۔ نواب قاسم علی خاں کا سپہ سالار نجف خاں انگریزوں سے مل گیا، جس کے باعث متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی۔ بکسر کی جنگ میں شکست کے بعد نواب ناصر خاں نے نواب احمد خان (والیِ فرخ آباد) کی ملازمت اختیار کر لی اور فرخ آباد میں مقیم ہو گئے، مگر نوازش کے والد حسین علی خاں اور چچا محمد قاسم خاں اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں چلے گئے اور مختلف عدالتی امور انجام دیتے رہے۔ نواب شجاع الدولہ نے ایک دفعہ نوازش کے چچا قاسم خاں سے کہا کہ اپنے والد کو بھی لکھنؤ بلوا لو، میں اُن کو اپنا نائب بنا لوں گا۔ قاسم خاں نے اپنے والد نواب ناصر خاں سے کہا کہ اگر آپ لکھنؤ چلیں تو شجاع الدولہ بہت بڑا اعزاز دینے کے لیے تیار ہیں۔ ناصر خاں نے کہا:

> ''احمد خان کے تین ہزار تین لاکھ کے برابر ہیں، کیونکہ جب میں احمد خان کی ملاقات کو جاتا ہوں تو احمد خان تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، اگر شجاع الدولہ کے ہاں دروازے پر انتظار کرنا پڑا تو موت سے بدتر ہوگا۔'' (۳۶)

نواب احمد خان بنگش (والیِ فرخ آباد) نواب ناصر خاں کا بہت احترام کرتے تھے۔ خود ناصر خاں کے مکان پر جاتے تھے۔ جب ناصر خاں کا انتقال ہوا تو احمد خان کے حکم سے اُن کا لڑکا مظفر جنگ مع ارکانِ دولت جنازے میں شریک ہوا۔ لکھنؤ میں اس خاندان کو بہت پذیرائی ملی اور انھوں نے دولت اور عہدوں کے ساتھ ساتھ بہت عزت بھی کمائی۔

پیدائش:

نوازش کب پیدا ہوئے؟ اس بات پر کافی اختلاف موجود ہے۔ قاضی عبدالودود کے مطابق: نوازش ۱۱۹۱ھ بمطابق ۱۷۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ (۳۷) محمد شمس الحق کے مطابق: نوازش کی پیدائش ۱۱۹۲ھ بمطابق ۱۷۷۸ء میں ہوئی۔ (۳۸) نوازش کے حالاتِ زندگی کے بارے میں اس عہد کی تواریخ اور تذکروں سے زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ صرف مصحفی نے 'ریاض الفصحاء' میں نوازش کے حالاتِ زندگی پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے مطابق:

> ''نوازش حسین خاں، نوازش تخلص عرف مرزا خانی ولد حسین علی خاں

ابنِ نواب ناصر خاں صوبہ دارِ کابل و پشاور و غزنی، قوم مغل چگتی وطن بزرگانش ...خود در اکبر آباد تولد شدہ و در لکھنؤ نشوونما یافتہ ۔۔‘‘(۳۹)

اِس سے پتا چلتا ہے کہ نوازش کی پیدائش اکبرآباد میں ہوئی ۔ مصحفی نے اکبرآباد کو کس طرح سے نوازش کی جائے پیدائش بتایا؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم کچھ حوالے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مصحفی کی یہ رائے غلط ہے اور نوازش کی جائے پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس اکبرآباد کو مصحفی نے نوازش کی جائے پیدائش بتایا ہے، وہ کہاں ہے؟ اکبرآباد، آگرے کا وہ نام ہے، جو مغل بادشاہ اکبر نے رکھا تھا۔ اِس کے علاوہ اکبرآباد نامی کوئی شہر، یا قصبہ اُس عہد میں دکھائی نہیں دیتا۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ مصحفی کے مطابق نوازش کی پیدائش آگرے میں ہوئی، جسے اُس زمانے میں اکبر کے رکھے ہوئے نام پر اکبرآباد کہا جاتا تھا، جیسا کہ اس سے پہلے نوازش کے خاندان کے باب میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ نوازش کے دادا نواب ناصر خاں ۱۱۵۲ھ بمطابق ۱۷۳۹ء میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ افشار کے ہندوستان پر حملے کے وقت کابل کے صوبہ دار تھے۔ کابل میں نواب ناصر خاں نے نادر شاہ کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام ہو کر راہِ فرار اختیار کی۔ کابل کے بعد نادر شاہ کی اگلی منزل دِلّی تھی، اس لیے نواب ناصر خاں نے دِلّی کی بجائے فرخ آباد کا رخ کیا اور وہاں قیام پذیر ہو گئے۔ فرخ آباد سے انھوں نے میر قاسم اور نواب شجاع الدولہ کے ساتھ مل کر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں حصہ لیا، جس میں ان کو شکست ہوئی۔ شکست کے بعد اُنھوں نے واپس فرخ آباد آ کر نواب احمد خان بنگش (والیِ فرخ آباد) کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے دونوں بیٹوں حسین علی خاں (والدِ نوازش) اور قاسم علی خاں نے شجاع الدولہ کی ملازمت اختیار کر لی، جس کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے آصف الدولہ نے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۷۷۵ء تک نوازش کے والد لکھنؤ میں موجود تھے۔ ۱۷۷۸ء میں نوازش متولد ہوئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نوازش کے والد حسین علی خاں ۱۷۷۵ء تک لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کی ملازمت میں تھے تو نوازش کی پیدائش کے موقع پر وہ لکھنؤ سے سیکڑوں میل دور اکبرآباد (آگرہ) میں کیوں موجود تھے؟ اس سے مصحفی کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

غالباً مصحفی نے غلطی سے اکبرپور کی جگہ اکبرآباد لکھ دیا ہے۔ اکبرپور نوازش کی جائے پیدائش ہو سکتی ہے۔ اکبرپور ضلع فیض آباد کا مشہور قصبہ ہے اور آج کل بھی ضلع فیض آباد کی تحصیل ہے اور فیض آباد، جونپور ریلوے سیکشن پر ریلوے جنکشن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نوازش کے والد اُن دنوں ملازمت، یا کسی سرکاری ذمہ داری کے سلسلے میں اکبرپور میں موجود ہوں اور وہاں پر نوازش کی ولادت ہوئی ہو۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوازش کی جائے پیدائش پر کافی اختلاف موجود ہیں اور یقین سے کہنا مشکل ہے کہ نوازش کی پیدائش کہاں ہوئی؟ تاہم غالب گمان یہ ہے کہ نوازش کی پیدائش اکبرپور میں ہوئی ہوگی۔

تعلیم وتربیت:

نوازش نے لکھنؤ میں پرورش پائی۔نوازش ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے،اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کا بھی بہت عمدہ انتظام کیا گیا۔اُن کی اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبان پر بہترین گرفت کا ثبوت اُن کے دیوان سے بکثرت ملتا ہے۔اُن کے کئی اشعار،مصرعے اور ٹکڑے وغیرہ فارسی میں ہیں۔عربی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔اس سے پتا چلتا ہے کہ اُنھوں نے اس وقت کے مروّجہ تمام علوم حاصل کیے تھے۔عمر کے ابتدائی سال اُنھوں نے حصولِ علم اور کھیل کود میں بسر کیے اور پھر اٹھارہ سال کی عمر میں شعر وشاعری کی طرف متوجہ ہوئے (۴۰)۔

میر سوز کی شاگردی:

جب نوازش کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو اُنھوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔اُس وقت لکھنؤ میں میر سوز کا طوطی بول رہا تھا۔نوازش نے جب اُن کو مشاعروں میں کلام پڑھتے دیکھا اور سُنا تو اپنا استاد منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔میر سوز نے بھی نوازش کی قابلیت کو بھانپ لیا اور ان کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔یوں نوازش کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہو گیا،جو اُن کی وفات تک جاری رہا۔

میر سوز کے اثرات نوازش پر بہت گہرے تھے۔اُنھوں نے تمام عمر میر سوز کو اپنا استاد مانا اور شعوری،یا لاشعوری طور پر میر سوز کے انداز کو اختیار کر لیا۔جن لوگوں نے نوازش کو شعر پڑھتے اور کہتے دیکھا،وہ اس بات پر متفق ہیں کہ نوازش شعر گوئی اور شعر خوانی میں میر سوز کا تتبع بہت عمدگی سے کرتے تھے۔بقولِ شاہ کمال:

"اپنے استاد کے انداز پر شعر کہتے ہیں اور اُن کی یادگار سمجھے جاتے ہیں۔"(۴۱)

نوازش بھی اپنی شاعری میں خود کو یادگارِ سوز کہتے ہیں۔

تھا یادگارِ سوز نوازش، ہزار حیف!
اس سوختہ کا آج جہاں میں نشاں نہیں

محمد حسین آزاد نے بھی آبِ حیات میں نوازش کے میر سوز کے انداز کو اپنانے اور شاعری کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے مطابق:

"نوازش اُن کے شاگرد کا نام ہم لڑکپن میں سنا کرتے تھے اور کچھ کہتے تھے تو وہی اُس انداز میں کہتے تھے۔"(۴۲)

اسی چیز کو مصحفی نے بھی بیان کیا ہے۔اُن کے مطابق:

''شعر کہنے اور پڑھنے میں میر سوز کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو میر سوز کا شاگرد کہتے ہیں۔ پہلا دیوان سوز کے طرز پر کہا ہے اور اب دوسرا دیوان بھی مرتب کر لیا ہے۔'' (۴۳)

نوازش کے دیوان میں بہت سے اشعار ملتے ہیں، جن میں انھوں نے بہت محبت سے میر سوز کا ذکر کیا ہے اور ان کا شاگرد ہونے پر فخر بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں میر سوز کا تتبع کرتے ہیں۔

ہر اِک ہے یوں تو نوازش! مقلدِ استاد
پہ وضعِ سوز میں کچھ تُو ہی انتخاب ہوا

کسی جگہ پر اُنھوں نے اِس بات پر فخر کیا ہے کہ وہ اپنے استاد کی طرح طالبِ دیدار اور عاشقِ زار ہیں:

کیوں نوازش! نہ چھپے وہ، کہ تُو ہے سوز کی طرح
عاشقِ زار جُدا، طالبِ دیدار جُدا

ایک اور جگہ پر وہ میر سوز کی وضع میں غزل پڑھنے پر فخر کرتے دکھائی دیتے ہیں:

پڑھ کے مجلس میں نوازش! میں غزل، سوز کی وضع
مرثیہ خواں کی طرح سب کو رُلا جاتا ہوں

نوازش کئی قافیوں میں پے در پے غزلیں لکھنے کو سوز کی شاگردی کا صدقہ جانتے ہیں:

غزل ان قافیوں میں تیسری بھی ایک میں لکھوں
مجھے بھی سوز سے آخر تو شاگردی کا ناتا ہے

کہیں وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری سے میر سوز کا نام روشن کر رہے ہیں:

ہماری روشنیِ طبع سے بہتیرے جلتے ہیں
نوازش! کرتے ہیں ہر سُو جو نامِ سوز روشن ہم

اگر کوئی ان کو میر سوز سے بہتر کہہ دے تو نوازش ان کا منہ نوچنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں:

اُن کا مُنہ نوچ لوں آتا ہے نوازش! جی میں
جبکہ اُستاد سے کہتے ہیں مجھے بہتر لوگ

یہ سب خارجی اور داخلی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ نوازش میر سوز کے بہت قابل اور ہونہار شاگرد تھے، جن کو میر سوز کی شاگردی پر بہت ناز تھا اور یہ ناز مرتے دم تک ان کے ساتھ رہا۔

لکھنؤ میں شاہانہ زندگی اور دیگر شعراء سے تعلقات:

نوازش نے لکھنؤ میں شاہانہ زندگی بسر کی۔ نوابان کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے اُن کو کسی معاشی تنگدستی کا سامنا نہ کرنا پڑا، ماسوائے اُس عرصے کے، جب وہ شاہی عتاب کے زیرِ اثر لکھنؤ سے اکبر پور بیر بر چلے گئے اور اُن کو اپنی زندگی کا ایک بہت سخت حصہ گزارنا پڑا۔

نوازش نے اپنے کلام میں اپنے گھر کے لیے 'دلکشا' کا لفظ استعمال کیا ہے:

زِنداں سے تنگ تر ہے نوازش! وہ یار بن

ہے لکھنؤ میں نامِ مکاں دلکشا غلط

تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ 'دلکشا' نواب سعادت علی خان کی تعمیر کردہ ایک بہترین کوٹھی تھی، جو اَب تک کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔ جعفر حسین مرزا کے مطابق:

"۔۔۔ان عمارات کے علاوہ سعادت علی خاں نے دریا پار دل آرام کوٹھی، دلکشا کوٹھی تعمیر کرائی تھی اور موتی محل کی اصل عمارت بھی انھیں کی حیات میں مکمل ہو چکی تھی۔ دل آرام کوٹھی اور دلکشا کوٹھی کے نمایاں آثار میرے عنفوانِ شباب تک موجود تھے۔ ممکن ہے کہ دلکشا میں اب بھی کچھ کھنڈرات نظر آ جائیں، لیکن اب وہاں پورا محلّہ آباد ہے اور ایک بڑی کالونی بن گئی ہے۔" (۴۴)

جس کوٹھی میں اب پوری کالونی بن چکی ہو، اس کی وسعت کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہوگا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوازش کا شمار اُس دور کے امراء اور نوابین میں ہوتا تھا۔

نوازش کی شاعری اور اس عہد کے تذکرے اور تواریخ اس بات کے گواہ ہیں کہ نوازش کوئی گمنام شاعر نہیں تھے، بلکہ اپنے عہد کے ایک ممتاز شاعر تھے اور اُن کی شاعری میں ہمیں اس دور کے تمام نمایاں شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ اِن شعراء میں جرأت سرِ فہرست ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے اشعار میں جرأت کا ذکر کیا ہے، بلکہ اپنے دیوان میں بہت سی غزلیں جرأت کی زمین میں کہی ہیں اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

قافیے چند نوازش! بہ زمینِ جرأت

اپنے انداز کے باندھے ہیں غزل وار نکال

جب جرأت کا انتقال ہوا تو نوازش نے اُن کی وفات کی تاریخ بھی لکھی، جو دیوانِ نوازش میں موجود ہے:

فکرِ تاریخِ فوتِ جرأت میں

جب کبھی مجھ سے ایک سال ہوا

کہا ہاتف نے رو کے از سرِ آہ!

آج جرأت کا انتقال ہوا (۱۲۲۴ھ)

نوازش کے ایک شاگرد کا تخلص مہر تھا۔ اتفاقاً جرأت نے بھی اپنے ایک شاگرد کا تخلص مہر رکھ دیا تو نوازش نے ان سے شکایت کی، جس پر جرأت نے اس تخلص کو فوراً تبدیل کر دیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دونوں میں بہت اچھے تعلقات اور وضع داری موجود تھی۔

''مرزا جانی نوازش کے ایک شاگرد کا تخلص 'مہر' تھا۔ محبت خان کے بیٹے منصور خان نے جب شاعری شروع کی تو جرأت نے ان کا تخلص 'مہر' قرار دیا۔ مرزا جانی نوازش نے جرأت سے شکایت بے نہایت کی تو جرأت نے کہا: 'مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے فقط مہر و محبت کو مربوط دیکھ کر تخلص اس کا قرار دیا'۔'' (۴۵)

اس کے علاوہ ان کی شاعری میں سودا سے متعلق اشعار بھی موجود ہیں اور ایک جگہ نوازش نے سودا کو ولی کہہ کر پکارا ہے اور میر سے چھیڑ خانی کی ہے:

ایسے ولیوں سے نوازشؔ! نہ اُلجھ، سودا ہے
چھیڑنا ہے تجھے منظور ہی تو میر کو چھیڑ

اس کے علاوہ شیخ امام بخش ناسخ کا ذکر بھی نوازش کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے:

دیکھ اس گرمی کو ناسخ نے نوازشؔ سے کہا:
آب کی جا ہے یقیں، برسیں شرر برسات میں

جب نوازش کانپور جلا وطن کر دیے گئے تو اپنے کئی شاگردوں کو ناسخ کی شاگردی میں دے دیا، جن میں معروف مرثیہ گو میاں دلگیر بھی شامل تھے۔

''میاں دلگیر (۱۱۴۸۔۱۲۶۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء۔۴۸۔۱۸۴۷ء)، جن کا اصل نام چھنو لال اور طرب تخلص تھا، منشی رسوا کے بیٹے اور قوم کے کائستھ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں سترہ سال کی عمر میں اُن کی شاعری کا آغاز ہوا اور اس کی نشوونما ہوئی۔ ابتداء میں رواجِ زمانہ کے مطابق غزل کہتے رہے اور نوازش حسین نوازش کی شاگردی اختیار کی۔ جب نوازش حسین عرف مرزا جانی کانپور چلے گئے تو ان ہی کی ہدایت پر شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔'' (۴۶)

نوازش کی ہدایت پر دلگیر کا ناسخ کا شاگرد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ نوازش دل سے ناسخ کا احترام کرتے تھے اور ان کے مقام سے خوب آگاہ تھے۔

اسی طرح اس شعر میں بھی میر تقی میر کا ذکر ملتا ہے، جو ان دنوں لکھنؤ میں موجود تھے اور غالباً نوازش سے بہت اچھے تعلقات بھی رکھتے تھے۔ میر تقی میر، نوازش کے ہم عصر تھے اور ان کا انتقال بھی ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا:

سنائے مثنویِ میر کوئی ناصح کو
کہ مُطلع یہ نہیں جذبِ آشنائی سے

اِس سے پتا چلتا ہے کہ نوازش کے اپنے عہد کے تمام اہم شعراء سے بہت اچھے تعلقات استوار تھے اور اُن سے نوازش کی چھیڑ چھاڑ اور چپقلش بھی چلتی رہتی تھی۔

نوازش کا مسلک:

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جس عہد میں نوازش نے جنم لیا، وہ عہد لکھنؤ میں شیعہ مسلک کے عروج کا عہد تھا۔ لوگ بہت فخر سے اپنے شیعہ ہونے کو بیان کرتے تھے اور اُس زمانے کے نوابین، امراء، حتیٰ کہ عوام الناس کی اکثریت شیعہ مسلک کی پیروکار تھی۔ عندلیب شادانی کے مطابق:

"لکھنوی شاعری کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے غزل میں خواہ کیسے ہی رندانہ، بلکہ عریاں اور حیا سوز مضامین کیوں نہ باندھے ہوں، مقطع میں وہ غالباً حصولِ سعادت کی نیت سے اکثر حضرت علی اور کبھی حضرت حسین، یا حضرت حسن، یا رسولِ مقبول، یا پنجتن اور امام زمن کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی ان بزرگوں کے توسل سے نجات کا طالب ہوتا ہے؛ کبھی اُن کے مزار کی زیارت کی تمنا کرتا ہے؛ کبھی ان کی محبت کا دم بھرتا ہے اور کبھی نعت و منقبت کو حسن المآب بتاتا ہے۔" (۴۷)

نوازش کا دیوان عندلیب شادانی کے بیان کو من وعن درست ثابت کرتا ہے اور ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جو نوازش کو اہلِ تشیع ثابت کرتی ہیں۔ وہ اپنے مسلک کو فخریہ یوں بیان کرتے ہیں:

جُز نہیں، ہے کُلِّ اسلام اپنا حُبِ پنجتن
اے نوازش! یہ طریقہ ہے مرے ایمان کا

حضرت علی کی مدح کرتے ہوئے وہ حد سے گزر جاتے ہیں اور ان کے نام کے نعرے نہ لگانے والوں کو نامرد قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے:

شیر ہی بھرتے ہیں نعرے اُس کے کچھ مردانہ وار
یوں تو ہر نامرد ہے، قائل شہِ مردان کا

ایک اور جگہ پر وہ حضرت علی کو شاہِ دین اور مشکل کشا قرار دیتے ہوئے مدد کے طالب ہیں:

شاہِ دین! جلد کرو کارِ نوازش آساں
یا علی! کام تم آتے ہو ہر اک مُشکل میں

حضرت امام حسین سے نوازش بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ ان کی شہادت کا ممنونِ احسان ہونا اپنے لیے باعثِ رحمت جانتے ہیں:

میں شہیدِ کربلا کا کشتۂ احسان ہوں
ورنہ کچھ بھی تھا ٹھکانہ اپنے اِس عصیان کا؟

کہیں وہ حضرت امام حسین کا سر قلم کرنے والے شمر کو ملامت کرتے دکھائی دیتے ہیں:

اے نوازش! سرِ شاہِ شہداء اور خنجر؟
شمر سا کم کوئی آفاق میں ملعوں ہو گا

حضرت امام حسین کی شہادت کا ماتم ہر شیعہ اپنے لیے باعثِ بخشش سمجھتا ہے۔ نوازش کے نزدیک جو لوگ دنیا میں سید الشہداء کا ماتم کرتے ہیں، وہی آخرت میں خنداں ہوں گے:

خنداں وہی کل حشر میں ہووے گا نوازش
فارغ جو کبھی شاہ کے ماتم سے نہ ہو گا

ایک اور جگہ پر وہ حضرت امام حسین کے ماتم کو روزِ محشر میں شاد ہونے کا سبب بیان کرتے ہیں:

روزِ محشر جو نوازش! تُو ہوا چاہے شاد
ماتمِ لختِ دلِ صاحبِ لولاک نہ چھوڑ

حضرت امام مہدی کو شیعہ حضرات زندۂ جاوید مانتے ہیں اور ہر مشکل میں ان سے براہِ راست مدد مانگتے ہیں۔ نوازش کے اشعار میں بالکل اِسی انداز میں حضرت امام مہدی سے مدد طلب کی گئی ہے:

میرے اعداء کی اُلٹ دے صف نوازش! وہ اِمام
مہدیِ آخر زماں، جو صاحبِ سجادہ ہے

ایک جگہ پر وہ خود کو حضرت امام مہدی سے مانگنے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں:

اے نوازش! مہدیِ ہادی سے تُو
مانگ لے جو کچھ تجھے درکار ہے

جس طرح عامۃ المسلمین مرنے کے بعد مدینہ میں دفن ہونے کی دُعا مانگتے ہیں، اِسی طرح بہت سے شیعہ حضرات مرنے کے بعد کربلا میں دفن ہونا باعثِ سعادت جانتے ہیں۔ نوازش بھی اِس چیز کے طلبگار ہیں:

کربلا میں ہو مرا دفن و کفن بعد از مرگ

حشر یا رب! ہو مرا حضرتِ شبیر کے ساتھ

اِن سب باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے کے اکثر نوابین، امراء اور شعراء کی طرح نوازش بھی شیعہ مسلک کے پیرو کار تھے اور اپنی شاعری میں بھی اُنھوں نے فطری طور پر اپنے مسلک کا اظہار ہے۔

جلاوطنی:

نوازش کو لکھنؤ سے بہت محبت تھی۔ اُن کی شاعری میں ہمیں اپنی سرزمین سے اُنس کے کئی ثبوت ملتے ہیں۔ ان کی زندگی میں بدقسمتی کا دور اُس وقت شروع ہوا، جب وہ لکھنؤ سے کانپور جلاوطن کر دیے گئے، جو اُس زمانے میں کالے پانی کی حیثیت رکھتا تھا اور وہاں شاہی معتوب افراد کو رہنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ بقولِ ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی:

''اس زمانے میں کانپور کالے پانی کی حیثیت رکھتا تھا اور اکثر شاہی معتوبین اور مجرموں کو جلاوطنی کی سزا دے کر دریائے گنگا کے پار اُتار دیا جاتا تھا، جس کے کنارے شہر کانپور آباد ہے۔ اس کے علاوہ کانپور چونکہ اودھ کی عملداری میں شامل نہیں تھا، اس لیے بعض اوقات قانون کی زد پر آئے ہوئے لوگ مواخذے، یا عتابِ شاہی سے بچنے کے لیے بھی کانپور کا رخ کرتے تھے۔ گویا کانپور مجرموں کا زنداں بھی تھا اور ملزموں کی جائے پناہ بھی۔ لوگ وہاں سزا کے طور پر بھی بھیجے جاتے تھے اور سزا سے بچنے کے لیے بھی جاتے تھے۔ دونوں صورتوں میں بادشاہ کی اجازت کے بغیر لکھنؤ آنا خطرے سے خالی نہ ہوتا تھا۔'' (۴۸)

نوازش کو کانپور کیوں جلاوطن کیا گیا؟ یہ بات ایک راز ہے اور اُس زمانے کے تذکرے اور تاریخیں بھی ہماری زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں۔ سعادت خان ناصر نے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں کچھ مختصراً بیان کیا ہے:

''چندروز سے بہ سبب خرید دیہات نیلام کانپور میں تشریف رکھتے ہیں، لکھنؤ میں آمدورفت بہت کم۔'' (۴۹)

اگرچہ سعادت خان ناصر نے نوازش کے کانپور میں قیام کی وجہ بعض دیہاتوں کی متاجری بیان کی ہے، جو کانپور میں نیلام ہو رہے تھے، مگر نوازش کا اپنا کلام اس کی وجہ کچھ اور بیان کرتا ہے:

یاں بھی اِک بت سے بھڑایا دل نے اے میرے خدا!
لکھنؤ سے تھا ہُوا حکم اِس پہ گنگا پار کا

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوازش کو کسی عورت سے عشق کی پاداش میں لکھنؤ سے کانپور جلاوطن کیا گیا تھا۔ گنگا پار کی اصطلاح اُس دور میں لکھنؤ سے جلاوطن کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی اور جلاوطن ہونے والے عام طور پر کانپور بھیجے جاتے تھے، جو ایک طرح کا کالا پانی تھا۔

جلاوطن ہونے کے بعد نوازش اپنے وطن کو نہیں بھول سکے۔ لکھنؤ ہمیشہ اُن کے دل میں زندہ رہا اور وہ لکھنؤ کی یاد

میں تڑپتے رہے اور خود کو گنگا پار ہونے پر کوستے رہے:

مجھ کو گنگا پار اس موسم میں کیا ہونا تھا ہائے!
یار کیا کیا لطف اُٹھاتے ہوں گے واں برسات کا

وہ دوسروں کو لکھنؤ کی یاد دلانے سے منع کرتے تھے:

لکھنؤ کی نہ دِلا یاد نوازشؔ! مجھ کو
کیا پڑی لوگ تھے ہم جن سے جدا ہائے! ہوئے

وہ اس وقت کو ہی نحس قرار دیتے تھے، جب اُنھوں نے لکھنؤ سے کوچ کیا تھا:

شکلِ وطن نہ دیکھی نوازشؔ! جو اب تلک
کِس نحس وقت میں نے کیا تھا وہاں سے کوچ؟

اُن کو اپنا لکھنؤ ہمیشہ رشکِ پرستان نظر آتا تھا اور وہ اس بات کے تمنائی تھے کہ حضرت مخدوم جہاں گشت ان کے دور میں ہوتے تو وہ اُن سے پوچھتے کہ اُنھوں نے پوری دنیا کی سیر کرنے کے بعد کیا کسی ایک وطن میں لکھنؤ جیسے اوصاف پائے تھے؟

لکھنؤ کیا کہ پرستاں ہی نہ ہو چیں بہ جبیں
ہے خطا فاش، جو یاں کچھ ختن کے اوصاف
ہوتے مخدومِ جہاں گشت، نوازشؔ! اگر آج
پوچھتے اُن سے ہم اس اپنے وطن کے اوصاف

نوازش ہمیشہ لکھنؤ کے لیے دُعا گو رہے، کیونکہ وہاں پر ان کے سب دوست اور ساتھی موجود تھے:

یارانِ چند اپنے نوازشؔ! وہاں پہ ہیں
آباد، یہ دُعا ہے، سدا لکھنؤ رہے

کانپور میں نوازش کو بہت سخت حالات سے گزرنا پڑا۔ ان کو وہاں پر کافی عرصہ بیکاری بھی برداشت کرنا پڑی، جس کے وہ عادی نہیں تھے:

اے نوازشؔ! لکھنؤ چھوڑے کو بھی عرصہ ہُوا
چھوڑتی تِس پر نہیں ہے پنڈ، بیکاری ہنوز

کانپور میں نوازش اکبر پور بیر بر میں رہائش پذیر تھے۔ آج کل اکبر پور بیر بر صوبہ اُتر پردیش کے ضلع کانپور کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں کی آب وہوا اور لوگ نوازش کے لیے بہت کوفت کا باعث تھے۔ نوازش نے ایک ہجو لکھی، جس میں

انھوں نے یہاں کے لوگوں کی زبان، معاشرت اور آب و ہوا کے خوب لتے لیے۔ انھوں نے یہاں کے لوگوں کی گفتگو کو پوچ قرار دیا:

یہ پوچ ہیں، اِن کی گفتگو پوچ
کہتے ہیں پوچھار مور کو 'پوچ'

اُن لوگوں کی زبان کی ہجو بیان کرتے کرتے نوازش اپنی زبان گالی گلوچ سے آلودہ کرنے سے نہیں چوکتے:

کہتے ہیں: 'پتو' بہو کو سرے
'لپش' ہے 'جورو' کو سادے یاں کے
یہ نُطفہ حرامیوں کے بانی
کہتے ہیں: بڑی بہن کو 'نانی'

یہاں کی مرطوب آب و ہوا میں سانپ اور بچھو کثرت سے تھے۔ نوازش نے اس کو بہت پرلطف انداز میں بیان کیا ہے:

اِس مرتبہ یاں ہیں سانپ بچھو
ہر گھر میں ہے 'مار، مار' ہر سُو

نوازش اور سرور کانپور میں:

کانپور کی تمام سختیوں اور مشکلات کے ساتھ ساتھ نوازش کے لیے جو بات باعثِ راحت تھی، وہ یہ تھی کہ نوازش کے قابلِ صد فخر شاگرد رجب علی بیگ سرور بھی اُن دنوں کانپور میں مقیم تھے۔ رجب علی بیگ سرور کی دلی کیفیت بھی نوازش سے کچھ مختلف نہ تھی اور وہ بھی کانپور میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اسی کیفیت کو رشید حسن خاں نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

''سرور نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ: 'اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا، عدمِ فرصت سے نہ کہتا تھا['نہ کہتا تھا' یہاں 'نہ لکھتا تھا' کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس طرح کی خامیاں سرور کی عبارت میں اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں]۔ یہاں تک کہ ماہِ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں اُن کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور کانپور جانا پڑا۔ یہ بستی ان کو 'ویران، پوچ و لچر' نظر آئی'۔'' (۵۰)

سرور کے حوالے سے رشید حسن خاں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''اشراف یہاں عنقا صفت ناپید اہیں، مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دل وحشت

منزل سخت گھبرایا، قریب تھا کہ جنون ہو جائے۔‘‘(۵۱)
نوازش نے بھی اہلِ کانپور کے لیے ’پوچ‘ کا لفظ استعمال کیا ہے اور سرور بھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔اس سے پتا چلتا ہے کہ دونوں کو مجبوری سے کانپور میں رہنا پڑا۔تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ نہ تو ہمیں نوازش کے کانپور جلاوطن ہونے کی وجوہات معلوم ہیں اور نہ ہی سرور کی۔تاہم کانپور میں نوازش کو سرور اور سرور کو نوازش کا دم بہت غنیمت تھا۔انھیں دنوں سرور نے اپنی شہرۂ آفاق داستان فسانۂ عجائب مکمل کی۔نوازش نے نہ صرف یہ کہ اس کتاب کی تاریخ کہی، بلکہ اس کی تصنیف میں بھی سرور کی بہت مدد کی۔ فسانۂ عجائب کے مقدمہ میں رجب علی بیگ سرور نے بہت محبت اور عقیدت سے نوازش کا ذکر کیا ہے۔

’’بندہ کمترین تلمیذ اور خوشہ چینِ خرمنِ سخن جناب قبلہ وکعبہ، استادِ شاگرد نواز، معزز وممتاز، مجمعِ فضل وکمال، نیک سیرت، فرخندہ خصال، خردآگاہ، دانش آموز، یادگارِ جناب میر سوز، عرفیِ عصر، سعدیِ زماں، رشکِ انوری وخاقانی نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خانی تخلص نوازش کا ہے۔حقیقتِ حال یہ مقال ہے ریختہ اور روزمرہ اردو کا ان پر ختم ہے۔شعر ان کے واسطے اور وہ شعر کی خاطر موزوں ہیں۔کہنے کے علاوہ پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے اگر طفلِ مکتب کا شعر زبانِ معجز بیان سے ارشاد کریں، فیض وہاں تاثیرِ بیان سے پسندِ طبعِ سحبان وائل ہو۔فی زمانہ تو کیا، سابقین، جو موجدِ کلام کو سن کر کوس لمن الملکی بجاتے تھے، ان کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسبِ لفظی، یا صنائع بدائع کے ہوں گے، وہ ان پر نازاں تھے اور متاخرین فخریہ سند گردانتے ہیں۔لہٰذا جس شخص کو فہمِ کامل، یا اس فن میں مرتبۂ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو، آپ کا دیوان بہ چشمِ انصاف ونظرِ غور سے دیکھے۔کوئی غزل نہ ہوگی، جو کیفیت سے خالی ہو؛ ہر مصرع گواہِ ہزار صنعت؛ ہر شعر شاہدِ معانی، با کیفیت مطلع سے مقطع تک ہر غزل پری کی صورت۔اکثر اشعار آپ کے تبرکاً وتیمناً بطریقِ یادگار بندے نے لکھے ہیں، جہاں لفظ استاد ہو، وہ آپ کا شعر سمجھو۔‘‘(۵۲)

سرور کے یہ الفاظ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اُن کو نوازش سے حد درجہ عقیدت تھی اور اُنھوں نے بہت محبت سے نوازش کے اشعار کو فسانۂ عجائب میں شامل کیا ہے۔نوازش نے فسانۂ عجائب کی تکمیل میں سرور کی جو مدد کی، اس پر رشید حسن خاں نے یوں رائے زنی کی ہے۔

’’یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ اس کتاب میں نوازش کے جتنے زیادہ اشعار ملتے ہیں، سرور کی کسی اور کتاب میں یہ صورت دکھائی نہیں دیتی۔وجہ اس کی صاف ہے کہ جس وقت یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس وقت نوازش اور سرور دونوں کانپور میں تھے۔سرور کو اس وقت تک بحیثیتِ مصنف شہرت حاصل نہیں تھی؛ اس وقت تک انھوں نے کوئی کتاب ہی نہیں لکھی تھی؛ نوازش شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور تھے۔اس کے علاوہ دنیاوی حیثیت سے بھی قابلِ ذکر حیثیت رکھتے تھے۔سرور کی طرح تنگدست نہیں تھے اور سرور کے استاد تو

تھے ہی؛ ان سب وجوہ سے سرور کی نیاز مندی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔‘‘ (۵۳)

رشید حسن خاں کا یہ بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں فسانۂ عجائب میں نوازش کے کئی اشعار ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض اشعار دیوانِ نوازش میں موجود نہیں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ نوازش نے یہ اشعار خاص فسانۂ عجائب کے لیے کہے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں، جو من وعن دیوانِ نوازش اور فسانۂ عجائب میں موجود ہیں۔ سرور نے ان اشعار کے ساتھ استاد لکھ دیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ اشعار نوازش کے ہیں۔

اشعار کے ساتھ ساتھ فسانۂ عجائب کی زبان و بیان اور اصلاح میں بھی نوازش کا رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں فسانۂ عجائب کے متن میں بھی بعض ایسے اشارے ملتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ نوازش نے فسانۂ عجائب کی اصلاح میں سرور کی بہت مدد کی ہے۔ غالباً یہ مدد اس وقت کی ہوگی، جب فسانۂ عجائب مکمل کرنے کے بعد سرور نے اس کو نوازش کی خدمت میں پیش کیا اور نوازش نے مناسب اصلاح کے بعد اس کا قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ رشید حسن خاں فسانۂ عجائب کے متن میں تبدیلیوں کے حوالے سے مزید کہتے ہیں:

> ’’اشعار کے متن میں ایسی تبدیلیاں ظاہر ہے کہ خود نوازش نے کی ہوں گی۔ شاگرد اس کی جرأت نہیں کر سکتا، خاص کر اُس وقت جب کہ استادِ محترم وہیں موجود تھے۔ اس سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال بیٹھ سا گیا کہ اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں سرور اپنے استاد نوازش سے برابر مشورہ کرتے رہے ہیں، یا اِسی بات کو یوں کہہ لیجیے کہ نوازش مشورہ دیتے رہے ہیں اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ (۵۴)

ڈاکٹر محمود الٰہی نے فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے مقدمے میں جو یہ لکھا ہے:

> ’’یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ فسانۂ عجائب کے متداول نسخوں کے آخر میں سرور کے استاد نوازش کا ذکر ملتا ہے، جس میں یہ اقرار کیا گیا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو بہ نظرِ اصلاح دیکھا تھا۔ خطی نسخے میں یہ بیان نہیں کیا ہے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ فسانۂ عجائب میں، جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، ان میں نوازش کے اصلاحی مشوروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔‘‘ (ص ۱۳)

فسانۂ عجائب مکمل ہونے کے بعد نوازش نے اس کا قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا:

برای خاطرِ یاران و احباب
سرور ایں قصہ را چوں کرد ایجاد
بجستم سال تاریخش نوازش
فلک ایں گلستانِ بے خزاں داد (۱۲۴۰ھ)

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ کانپور کی جلاوطنی کے دور میں فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور اور نوازش دونوں کے لیے بہت اچھی مصروفیت تھی، جس کی وجہ سے یہ سخت جلاوطنی کاٹنا دونوں کے لیے آسان ہوسکی۔
نوازش کی جلاوطنی کب ختم ہوئی اور وہ کب اپنی زندگی کا آخری حصہ گزارنے لکھنؤ پہنچے؟ یہ بات وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ تاہم ڈاکٹر نیر مسعود اس بارے میں کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مطابق نصیرالدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد سرور کو کانپور سے لکھنؤ آنے کی اجازت مل گئی اور وہ لکھنؤ لوٹ آئے۔ اس کے بعد بھی وہ برابر کانپور جاتے رہے۔ اس کی جو وجوہات سامنے آتی ہیں، اُن میں کانپور میں سرور کی اہلیہ، منہ بولے بیٹے اور استاد نوازش کا رہنا ہے:

''غالباً یہ بادشاہ نصیرالدین حیدر ہی تھے، جو نوجوانی میں تخت نشین ہوئے تھے۔ یہ نوجوان بادشاہ سرور کے حق میں اس لحاظ سے بہت مہربان ثابت ہوا کہ اس کے زمانے میں لکھنؤ کا قیام سرور کے لیے ممکن ہوگیا اور وہ کانپور کی رہائش سے چھٹکارا پاکر اپنے محبوب شہر میں واپس آگئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک بار کانپور سے نکلنے کے بعد سرور پھر اُدھر کا رخ نہ کرتے، لیکن ہم ان کو اس کے بعد بھی برابر کانپور جاتا پاتے ہیں۔ اس کے چند اسباب نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ سرور کے استاد نوازش کانپور میں رہنے لگے تھے۔''(۵۵)

فسانۂ عجائب کی تکمیل ۱۲۴۰ھ بمطابق ۱۸۲۴ء میں ہوئی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ نوازش ۱۸۲۴ء تک کانپور ہی میں موجود تھے۔ نوازش نے اپنے دیوان میں مختلف تواریخ کہی ہیں۔ اُن میں ایک تاریخ اُن کے کسی 'محسن' کو خلعت ملنے کی خوشی میں کہی گئی ہے۔ نوازش نے سالِ تاریخ کا مادہ 'خلعتِ سعید' نکالا ہے، جس سے ۱۲۴۴ھ کا سنہ نکلتا ہے۔ سنۂ عیسوی میں یہ سنہ ۱۸۲۸ء بنتا ہے۔

پرتوِ لطفِ ظلِ سُبحانی
میرے محسن پہ جب مزید ہوا
سُن کے میں نے کیا دوگانۂ شکر
مجھ کو گویا کہ روزِ عید ہوا
سالِ تاریخ اُس کی خِلعت کا
مادہ خلعت سعید ہوا(۱۲۴۴ھ)

اِس کا مطلب ہے کہ نوازش ۱۸۲۸ء تک جلاوطنی کاٹنے کے بعد لکھنؤ واپس پہنچ چکے تھے، ورنہ لکھنؤ سے کوسوں دور کانپور میں بیٹھ کر کسی دوست احباب کی خوشی کی تاریخ بیان کرنا بہت ہی ناقابلِ فہم دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ کانپور میں نوازش بالکل ناخوش تھے اور وہاں کے لوگوں سے بھی بدظن تھے۔ یوں کانپور میں ان کے کسی سے اتنے قریبی تعلقات قائم ہونا کہ وہ اس کو اپنا محسن قرار دیں اور پھر اس کو خلعت ملنے کی خوشی میں تاریخ کہنا بہت

محال دکھائی دیتا ہے۔ یقیناً یہ تاریخ نوازش نے لکھنؤ میں کہی ہوگی۔ یوں ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نوازش کی جلاوطنی کا خاتمہ ۱۸۲۸ء، یا اُس سے کچھ عرصہ قبل ہوا تھا۔

اِس بات کو نیّر مسعود صاحب کی رائے سے بھی تقویت ملتی ہے کہ نصیرالدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد سرور کی جلاوطنی ختم ہوئی، مگر نوازش کانپور میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ نصیرالدین حیدر کی تخت نشینی ۱۹/اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوئی اور ان کی حکومت ۷/جولائی ۱۸۳۷ء تک ان کی وفات تک قائم رہی۔ یوں ہم حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نصیرالدین حیدر کی ۱۸۲۷ء میں تخت نشینی ہی وہ مبارک سال ہے، جس میں پہلے رجب علی بیگ سرور کی جلاوطنی ختم ہوئی مگر وہ برابر نوازش سے ملنے لکھنؤ جاتے رہے اور بالآخر نوازش کو بھی اُسی سال، یا اُس سے اگلے سال ۱۸۲۸ء میں کانپور کی جلاوطنی سے نجات ملی اور وہ دوبارہ لکھنؤ پہنچ گئے۔

کانپور سے واپسی کے بعد بھی نوازش کانپور کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے رہے:

یہ لکھنؤ ہے نوازش! جو یاں اُڑی سو اُڑی
جو کانوں کان نہ سنیے، یہ کانپور نہیں

ایک اور جگہ لکھنؤ سے کئی سال جلاوطن ہونے کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

بھربھرا پن وہ طبیعت کا گیا اپنی نہ آہ!
لکھنؤ سے سالہا، ہر چند ہم باہر رہے

نوازش کے آخری ایام اور وفات:

نوازش کو اُن کی عمر کے آخری برسوں میں کئی بیماریوں نے گھیر لیا اور بڑھاپے نے بھی خوب ستایا۔ کئی اشعار میں انھوں نے اپنے بڑھاپے اور بیماریوں کو بیان کیا ہے:

ضُعفِ پیری سے جو میں نے خواہشِ پا بوس کی
بولے! جاوے بھاڑ میں چاہ ایسے بوڑھے پھوس کی

کہیں پر وہ خود جوانی کے دن صبا ہونے کا نوحہ کرتے نظر آتے ہیں:

چوچلے بوڑھے مجھے بھاتے نہیں
دن وہ جوانی کے صبا ہو گئے

کبھی وہ بال سفید ہونے پر دل کو اپنی چاہ کا منہ کالا کرنے کا کہتے دکھائی دیتے ہیں:

چاہ کا منہ بس کہیں کالا بھی کر

بال سفید اب تو دِلا! ہو گئے

کسی جگہ وہ اپنے بڑھاپے اور خشک جسم کو نوجوانوں سے بھی بہتر قرار دیتے دکھائی دیتے ہیں:

نوجوانوں میں ہے پانی مرتا میری سوخت سے
گو تر و تازہ ہیں وہ اور جسم میرا خشک ہے
اتنے بوڑھے پھوس ہونے پر نوازش کے نہ جا
خوب جلتی ہے وہ ہیزم، جو سراپا خشک ہے

نوازش کے دیوان میں ایک مخمس پورے کا پورے نوازش نے اپنے بڑھاپے کے مصائب اور آلام پر لکھا ہے، جس کے چند بند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

وہ بھوک، نہ وہ پیاس، نہ وہ ہضم غذا ہے
وہ میں ہوں، نہ وہ دل ہے، نہ وہ حرص و ہوا ہے
اگلا سا تن و توش، نہ وہ ڈیل رہا ہے
پیری نے زبس زِیست سے جی سیر کیا ہے
کھانے کی وہ لذّت ہے نہ پانی کا مزا ہے

بینائی میں فرق آ گیا، رعشہ ہے بدن میں
اُس تنتنے [طنطنے] کے بدلے پڑیں جھرّیاں تن میں
گر بات بھی کہیے تو نہیں لوچ سخن میں
کچھ گر پڑے، کچھ ہل رہے ہیں دانت دہن میں
کھانے کی وہ لذّت ہے نہ پانی کا مزا ہے

ہونے کو تو بوڑھا نہ ہُوا کون جہاں میں
ایسا بھی پھنسا ہو گا نہ کوئی خفقاں میں
جو مر گیا، میں فوت ہوا اپنے گماں میں
صابن سا گھلا رہتا ہے ہر وقت دہاں میں
کھانے کی وہ لذّت ہے نہ پانی کا مزا ہے

ان اشعار سے صاف پتا چلتا ہے کہ نوازش اس وقت کافی ضعیف اور بیمار ہو چکے تھے اور اپنی وفات تک یقیناً ان

کی عمر میں اضافہ ہو گیا ہو گا اور بیماری بھی بڑھ گئی ہو گی۔ آخر انھیں بیماریوں اور بڑھاپے سے لڑتے ہوئے نوازش نے ۷۶، یا ۷۷ سال کی عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ سالِ وفات میں بھی اختلاف موجود ہے۔ قاضی عبدالودود نے دیوانِ شہید نسخۂ خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے حوالے سے ۱۲۷۱ھ بمطابق ۱۸۵۳ء بیان کیا ہے:

''دیوانِ شہید شاگردِ ناسخ (نسخۂ کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ نوازش کا سالِ وفات ۱۲۷۱ھ ہے۔'' (۵۶)

ڈاکٹر نیّر مسعود کے مطابق سالِ وفات ۱۲۷۱ھ بمطابق ۱۸۵۴ء تھا۔

''۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں سرور نے دہلی اور میرٹھ کا سفر کیا۔ غالباً اسی سفر میں وہ پہلی مرتبہ مرزا غالب سے ملے۔ لکھنؤ آ کر وہ سخت بیمار پڑ گئے۔ بیماری اپنے پورے زور پر تھی کہ سرور کے دل پر ایک اور داغ پڑا، یعنی ان کے شفیق استاد مرزا خانی نوازش کا انتقال ہو گیا۔ یہ دھچکا سرور کے لیے سخت ثابت ہوا اور استاد کی موت نے اُن کو خود رفتگی کے عالم میں مبتلا کر دیا۔'' (۵۷)

یعنی اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ نوازش کی وفات ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان ہوئی تھی، تاہم یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

تدفین:

وفات کے بعد نوازش لکھنؤ میں سپردِ خاک ہوئے، لیکن ان کی تدفین کہاں ہوئی؟ یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے، تاہم ہمیں مختلف تواریخ میں نوازش کے چچا قاسم علی خاں کے باغ کے قریب قبرستان کا ذکر ملتا ہے، جہاں میر حسن بھی مدفون ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''۱۲۰۰ھ ہی میں میر حسن بیمار پڑے اور بقولِ شیر علی افسوس: ۵ر محرم اور بقولِ مصحفی: عشرۂ ماہِ محرم ۱۲۰۱/۱۷۸۶ء کو وفات پائی اور لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علی خاں کے باغ کے پیچھے مدفون ہوئے۔'' (۵۸)

اسی بات کو حاشیے میں مزید وضاحت سے لکھتے ہیں:

''مسعود حسن رضوی ادیب نے یکم اگست ۱۹۵۴ء کو لکھا کہ میر حسن کی قبر کا کوئی نشان نہیں ہے (میر حسن اور ان کا زمانہ: ڈاکٹر وحید قریشی: ص ۳۱۲)، لیکن اسلافِ میر انیس (ص ۷۹، ۸۰) کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۷۰ء میں لکھا ہے کہ: ۱۱ر نومبر ۱۹۶۴ء کو سید محمد ہادی صاحب لائق کے ہمراہ میر حسن کے مزار کی زیارت کی۔ قبر شکستہ حالت میں مفتی گنج کی ایک وسیع افتادہ اراضی کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ یہاں کبھی نواب قاسم علی خان کا باغ تھا۔ اگر قبر کی مرمت نہ کی گئی تو کچھ مدت بعد اس کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔'' (۵۹)

نواب قاسم علی خاں نوازش کے چچا تھے اور اس قبرستان میں میر حسن کا مدفون ہونا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ

ان کا خاندانی قبرستان تھا، جس میں قریبی تعلقات ہونے کی وجہ سے میر حسن مدفون ہوئے اور یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نواز ش بھی اسی باغ میں مدفون ہوئے ہوں گے۔

دیوانِ نوازش کا منحصر بفرد خطی نسخہ:

دیوانِ نوازش کا منحصر بفرد قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ کا مخزونہ ہے۔ اس نسخے کی تفصیلات کچھ یوں ہیں:

سلسلہ نمبر	۱۲۲
پروگریس نمبر	۶۳۷۲
ہینڈلسٹ نمبر	۶۵
نام مصنف	نوازش۔ نوازش حسین عرف مرزا خانی
نام کتاب	دیوانِ نوازش
تعدادِ اوراق	۳۸۷
تعدادِ سطور ہر صفحہ	۱۳
خط	نستعلیق مائل بہ شکستہ
کاتب	نامعلوم

اِس نسخہ میں ایک صفحہ نثر کا ہے۔ یہ دیوان کا دیباچہ ہے۔ فارسی میں ہے اور نوازش کے اپنے خط میں ہے۔ یہ نوازش کی واحد معلوم تحریر ہے، جس کا ترجمہ آخر میں دیا جا رہا ہے۔ اس نسخہ میں اشعار کی تعداد کم وبیش ۶۵۰۰ ہے۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ نوازش نے یہ دیوان امیر حسن خان کی فرمائش سے نقل کرایا۔ دیباچے کے آخر میں ۷/ذی الحج مرقوم ہے۔ سنہ میں صرف ۴ پڑھا جاتا ہے، باقی کے ہندسے ضائع ہو گئے ہیں۔ دیوان میں زیادہ تعداد غزلیات کی ہے، تاہم کچھ رباعیات، تاریخیں، تکڑ (مثلث)، مخمسات، مسدسات اور مثنویات بھی شامل ہیں۔ مخمسات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو معمولی، دوسرے وہ جن کے ہر بند کے آخر میں ایک ہی مصرع آتا ہے خواہ فارسی ہو، خواہ اردو۔ قسم اول کے مخمسوں میں سب سے زیادہ سوز کی غزلوں کی تضمینیں ہیں، یعنی ۵ تضمینیں۔ اس کے علاوہ درد کی ۲، ملتمس کی ۳، خسرو کی ۲، جرأت کی ۲، عیشی کی ایک اور شرر کی ایک ایک غزل کی تضمین شامل ہے۔ اِن کے علاوہ مسدسات میں بھی قائم اور انشاء کے اشعار کی تضمین کی گئی ہے۔ معلوم شعراء کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے شعراء کے اشعار کی تضمین کی گئی ہے، جن کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔

مجموعی طور پر نسخے کی حالت اچھی ہے۔ کاغذ اچھا استعمال کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ صدی گزرنے کے باوجود نسخہ بہتر حالت میں ہے۔ تاہم کئی جگہ پر الفاظ مٹے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے پڑھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض جگہ خط اتنا شکستہ ہے کہ پڑھنا محال ہو جاتا ہے۔ الفاظ کو ملا کر لکھنے کی وجہ سے بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کاتب کا کاغذ پر سے قلم اُٹھانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ بعض جگہ حاشیے پر اشعار لکھے گئے ہیں، جو اتنے

باریک خط میں ہیں کہ بغور دیکھنے پر ہی نظر آتے ہیں۔ نسخے میں کہیں تاریخِ کتابت، یا ترقیمہ موجود نہیں، جس کی وجہ سے زمانۂ کتابت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

تلامذۂ نوازش:

نوازش اِس لحاظ سے بہت خوش نصیب رہے ہیں کہ اگر اُن کو میر سوز جیسے نابغۂ روزگار شاعر کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تو دوسری طرف اُن کے اپنے تلامذہ میں سے بہت سارے شہرت کے بامِ عروج تک پہنچے۔ ان میں رجب علی بیگ سرور اور دلگیر سرِ فہرست ہیں۔ نوازش جب لکھنؤ میں مقیم رہے تو یہاں بھی بہت سے شاگردانِ رشید موجود تھے۔ جب وہ کانپور چلے گئے تو وہاں بھی اُنھوں نے بہت سے شاگرد بنائے، جن میں سے چند کا ذکر مختلف تذکروں میں موجود ہے۔

نوازش کے زیادہ نمایاں تلامذہ کے احوال اور ان کے کلام کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

رجب علی بیگ سرور:

نوازش کے شاگردوں میں سب سے نمایاں نام رجب علی بیگ سرور کا ہے، جن کو فسانۂ عجائب سے لافانی شہرت ملی، جو آج تک قائم ودائم ہے۔ یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ رجب علی بیگ کی وجۂ شہرت نثر نگاری اور داستان ہے، جبکہ نوازش شاعر تھے۔ اس سے لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ سرور نے شاعری میں نوازش کی شاگردی اختیار کی ہوگی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

> ''سرور شاعر بھی تھے اور نثر لکھنے سے پہلے صرف شاعری کرتے تھے۔ نوازش حسین خاں نوازش عرف مرزا جانی نوازش کے شاگرد تھے اور حسبِ ضرورت مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔'' (۶۰)

تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کے مطابق سرور صاحب دیوان شاعر تھے۔

> ''مصنف قصۂ جانِ عالم مرزا رجب علی بیگ سرور ولد مرزا اصغر علی باشندہ لکھنؤ ایک دیوان اور مشغلۂ سلطانی ترجمہ شمشیر خانی اور شگوفۂ محبت ان کا ہے۔ شاگرد مرزا خانی نوازش۔'' (۶۱)

اِس سے پتا چلتا ہے کہ سرور ایک صاحبِ دیوان شاعر تھے اور فسانۂ عجائب میں بھی انھوں نے نوازش کے اشعار کے ساتھ ساتھ کئی جگہ اپنے اشعار بھی لکھے ہیں۔

مختلف تذکروں میں سرور کے اشعار ملتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ شعر گوئی پر کافی قدرت رکھتے تھے، مگر فسانۂ عجائب کی شہرت نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

ذکر ہر شعر میں ہے اس بتِ لاثانی کا
میرے دیواں سے مرقع ہے خجل مانی کا

قدمِ یار پہ اس طرح سے ماتھا رگڑا
مٹ گیا صاف نوشتہ مری پیشانی کا (۶۲)

بعض تذکروں میں سرور کی یہ خوبصورت غزل ملتی ہے:

کسی دشمن نے ایسا دوست کو میرے پڑھایا ہے
بدل لیتا ہے طوطے کی طرح سے آنکھ دم بھر میں
نہ ہم نازک مزاجوں سے اُٹھیں گے ناز دلبر کے
یہ غمزہ جو اُٹھاتا تھا وہ اب دل ہی نہیں بر میں
جگہ اب خالِ ہندو کی ہوئی ہے مصحفِ رخ پر
عداوت اُٹھ گئی جو تھی مسلماں اور کافر میں
مِلا دیتا گلے سے کیوں نہ یارِ نکتہ داں اس کو
پڑی تجنیسِ خطی ہے تھی خجر اور خنجر میں
مِلایا خاک میں برگشتگی نے طبع جاناں کی
بسان شیشۂ ساعت پلٹتا ہے گھڑی بھر میں
ہمارے دل میں اس کی یاد واں سینہ میں کینہ ہے
وہاں ہے لعل میں پتھر یہاں ہے لعل پتھر میں
مثالِ شمع سر جلتا رہا ہے رات بھر میرا
پر پروانہ شاید مِل گیا تھا بالشِ پر میں
بنے اب اُس سے یا بگڑے الم ہے اس کا لاحاصل
وہی ہوگا لکھا ہے جو سرور اپنے مقدر میں (۶۳)

دلگیر:

میاں دلگیر لکھنؤ کے ایک نومسلم شاعر تھے۔ ان کا اصل نام چھنو لال تھا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے غزل اور اسلام قبول کرنے کے بعد مرثیہ گوئی سے شہرت حاصل کی۔ بقولِ مولانا حسرت موہانی:

"میاں دلگیر کا پہلا نام چھنو لال تھا۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے مرثیہ گوئی اختیار کر کے شہرت حاصل کی۔ غزل میں طرب تخلص کرتے تھے۔" (۶۴)

جب تک نوازش لکھنؤ میں رہے، دلگیر ان کی شاگردی کرتے رہے اور جب نوازش کانپور جلاوطن ہو گئے تو انھوں نے نوازش کے کہنے پر ناسخ کی شاگردی اختیار کر لی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''میاں دلگیر (۱۱۴۸ھ۔۱۲۶۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء ۴۸۔۱۸۴۷ء)، جن کا اصل نام چھنولال اور طرب تخلص تھا، منشی رسوا کے بیٹے اور قوم کے کائستھ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں سترہ سال کی عمر میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا اور اس کی نشو ونما ہوئی۔ ابتداء میں رواج زمانہ کے مطابق غزل کہتے رہے اور نوازش حسین نوازش کی شاگردی اختیار کی۔ جب نوازش حسین عرف مرزا خانی کانپور چلے گئے تو ان ہی کی ہدایت پر شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔'' (۶۵)

دلگیر کے حالاتِ زندگی پر سعادت خان ناصر نے یوں روشنی ڈالی ہے:

''شاعرِ خوش تقریر، مرثیہ گوئے حضرت شبیر، میاں دلگیر سابق میں ہنود نام چھنولال، قوم کائستھ، سکسینہ برادری مہاراجہ جھاؤلال اور افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام سے تھا۔ چہاردہ سالگی میں سببِ موزونیِ طبع کے شاگرد مرزا خانی نوازش کا ہوا اور طرب تخلص کیا۔ آخر شوقِ مرثیہ گوئی اسے پیدا ہوا اور طرف وسیلۂ نجات کے شیدا (ہوا) تاثیرِ غم حضرت امام حسین علیہ السلام سے طرب سے کنارہ کر کے 'دلگیر' (اپنا) تخلص قرار دیا۔ سال یک ہزار دو صد وسی سن ہجری میں شرفِ اسلام سے مشرف اور مشہور اور شیعہ امیر المومنین سے ہم طرف ہوا۔ اور جب مرزا خانی صاحب نے سکونت کانپور کی اختیار کی، حسب الارشاد اپنے استاد کے وہ ناسخ سے مستفید رہا۔'' (۶۶)

دلگیر کی غزل کے جو نمونے دستیاب ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی لکھنؤ کی روایتی خارجیت پسندی اور رنگین مزاجی کے دلدادہ تھے اور معاملہ بندی میں نوازش کے پیرو کار تھے۔

کس کو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم
ناسور بن گئے ہیں عزیزو بجائے چشم

باتیں تری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل
وہ مدعائے گوش ہے، یہ مدعائے چشم

آئے طرب جو تیرا وہ خوش چشم باغ میں
نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم (۶۷)

سادہ سے الفاظ میں گہری بات کہنے کے ہنر سے بھی آشنا ہیں:

کام اپنا خیالِ رخِ جاناں سے نکالا

کارِ شبِ عشرت شبِ ہجراں سے نکالا
یہ طالبِ ایذا ہیں کہ جو پا میں چبھا خار
تم نے جو نکالا اسے پیکاں سے نکالا (۶۸)

مہر:

مہر بھی نوازش کے شاگرد تھے۔ مہر کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ جن دنوں نوازش لکھنؤ میں تھے، ان دنوں نوازش سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے تخلص کے معاملے پر نوازش اور جرأت میں شکر رنجی ہوگئی تھی، تاہم جلد ہی غلط فہمی دور ہوگئی:

''مرزا جانی نوازش کے ایک شاگرد کا تخلص 'مہر' تھا۔ محبت خان کے بیٹے منصور خان نے جب شاعری شروع کی تو جرأت نے ان کا تخلص 'مہر' قرار دیا۔ مرزا خانی نوازش نے جرأت سے شکایت بے نہایت کی تو جرأت نے کہا: 'مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے فقط مہر و محبت کو مربوط دیکھ کر تخلص اس کا قرار دیا'۔'' (۶۹)

شعلہ:

اصل نام شیخ محمد سلیمان تھا، جبکہ شعلہ تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ محمد عیسیٰ تھا۔ لکھنؤ میں پلے بڑھے تھے۔ زیادہ کلام فارسی میں تھا، مگر اردو میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے اور اردو میں نوازش سے اصلاح لیتے تھے۔ (۷۰)

نمونہ کلام یہ ہے:

سنتے ہیں تیرا یار ملا اور کسی سے
دل تو بھی چل اب دل کو لگا اور کسی سے
ہم وہ ہیں کہ مر جائیں پر اے رشکِ مسیحا!
تجھ بن کبھی پوچھیں نہ دوا اور کسی سے (۷۱)

راغب:

اصل نام مرزا کریم بیگ، جبکہ تخلص راغب تھا۔ والد کا نام میرزا ببر بیگ تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بعد میں حیدر آباد چلے گئے۔ علمِ شعر و سخن میں نوازش سے کسبِ فیض کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:

کہتی آپس میں تھیں ہو بلبلیں نالاں کئی
اے خزاں تو نے اجاڑے ہیں گلستاں کئی (۷۲)

یہ خوبصورت غزل بھی اُن کے کلام پر قادر ہونے کی گواہی دے رہی ہے:

وہ لڑ کر ہم سے شادی کے بہانے
لگے غیروں کے گھر چھپ چھپ کے جانے
گلے آ کر لگایا دل ربا نے
مجھے یہ دن دکھایا پھر خدا نے
سوئے عشاق آ او ناوک انداز!
یہی ہیں تیرِ آفت کے نشانے
مرے قصے کے ہوتے اس کے آگے
عزیزو! مت کہو پچھلے فسانے
ہے بندہ آج کل فرہاد اور قیس
یہی اللہ کے ہیں کارخانے
پرستاں ہے پری رویوں کا کوچہ
نہ اس کو چھوڑ اے راغب! دِوانے(۷۳)

اظہر:

اظہر کا اصل نام شیخ اظہر علی تھا، جبکہ اظہر تخلص کرتے تھے۔ کانپور کے رہنے والے تھے۔ غالباً ان دنوں نوازش کے منظورِ نظر ہوئے، جب نوازش کانپور میں جلاوطن تھے۔ بقولِ سعادت خان ناصر:

"کلام میں اس کے سکنجبین کا مزہ، دافعِ صفرا، شیخ اظہر علی تخلص اظہر (ساکن کانپور) کلام اس کا مرزا خانی کا منظورِ نظر۔"(۷۴)

نمونۂ کلام یہ ہے:

برنگِ مرغِ بسمل وصل کی شب خوب تڑپایا
عجب تاثیر ہے زاہد تری اللہ اکبر میں
وہ دیکھ آئینہ خود عاشق ہوا ہے اپنی صورت پر
مرا محشر کو ہو گا ہاتھ دامانِ سکندر میں(۷۵)

مخلص:

ان کا نام مہدی حسن ولد سید دلیر علی، جبکہ تخلص مخلص تھا۔ اصل وطن دارانگر جہان آباد تھا، مگر کانپور میں مقیم تھے۔ کانپور کی دیوانی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ شعر وسخن کا شوق رکھتے تھے اور نوازش سے اصلاح لیتے تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے (۷۶)۔ بطور نمونہ کلام غزل درج کی جاتی ہے۔

غمِ دلدار کیا کرتا ہے غم خواریِ دل
اور تو کون کرے ہجر میں دلداریِ دل

کیا ہی پُر درد ہے یہ حالِ گرفتاریِ دل
زار زار آپ بھی روئیں جو سنیں زاریِ دل

زخمِ دل سبزۂ خط دیکھ کے اچھے ہو جائیں
یاالٰہی! ہو یہی مرہمِ زنگاریِ دل

آتشِ عشق سے جل جل کے اگر داغ لگے
ہر گلِ زخم میں ہو بوئے وفاداریِ دل

صورتِ شانہ جو زلفوں سے اُلجھ کر چھوٹا
چھوٹا ہو جائے گا دعوائے گرفتاریِ دل

واصلِ حق کی خطا ہے بخدا عینِ ثواب
کعبۂ دل کی ہے پوشش یہ سیہ کاریِ دل

بخت خفتہ نہ رہا مظہرِ انوار ہوا
تیرے مخلص کو ملی دولتِ بیداریِ دل(۷۷)

عسکر:

عسکر کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا۔ اصل نام مولوی عسکری، جبکہ عسکر تخلص کرتے تھے۔ ان کو نوازش کا منظورِ نظر کہا جاتا تھا (۷۸)۔ عسکر کی یہ غزل نمونۂ کلام کے طور پر ملتی ہے:

غمِ فرقت کا دِلا! کھول نہ تو راز عبث
کون سنتا ہے درِ دل کو نہ کر باز عبث

ہم گرفتارِ قفس ہیں نہ دلا! یادِ چمن

ہم سے ہے بادِ بہاری یہ ترا ناز عبث
زردیِ رخ سے عیاں رازِ محبت ہو گا
کہہ کے بدنام ہوئے ہیں مرے غماز عبث
اس کے کوچہ کے سوا اور کہاں جاؤں گا
طائرِ روحِ رواں کرتا ہے پرواز عبث
مر گئے ہم تری فرقت میں نہ جاں بخشی کی
او مسیحا! نظر آیا ترا اعجاز عبث(۷۹)

الطاف:

الطاف کو تلامذۂ نوازش میں اس اعتبار سے بہت اہمیت حاصل ہے کہ وہ نوازش کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ اصل نام کلبِ حسین خاں، جبکہ تخلص الطاف تھا(۸۰)۔ یہ چند اشعار ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی سے خوب فیض حاصل کیا تھا:

کہا جوڑی قلم رکھو گے پٹی کے منڈانے کو
بگڑ بیٹھے، کہا اُن سے جو میں نے خط بنانے کو
کسی کو جامِ جمشیدی، کسی کو حشمتِ دنیا
عدم سے زیست لائی تھی ہمیں ایذا دکھانے کو
کہا چشموں کو تر کر میری تربت پر تو یہ بولا:
جلا دو شمع اس کی گور پر آنسو بہانے کو(۸۱)

مٹی کو مری چکر کیا چاک دکھاتا ہے
سو پیچ بیک گردش افلاک دکھاتا ہے

ہیں غیرتِ آئینہ جو صورتیں دنیا میں
ان کو بھی تو یہ گردوں کر خاک دکھاتا ہے(۸۲)

کل یہ الطاف سے بولا بصد الطاف وہ شوخ

بعد مدت نظر آیا تو کدھر رہتا ہے(۸۳)

شرر:

ان کا اصل نام مرزا ابراہیم بیگ، جبکہ تخلص شرر تھا۔ میر قطب الدین باطن نے اپنے تذکرہ گلستانِ بےخزاں میں ان الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے:

''شرر تخلص مرزا ابراہیم بیگ نام۔۔۔۔ان کے سخن پر نوازش حسین خان نوازش کی نوازش سنگِ خارائے سخن کے لیے بیستونِ کاغذ میں تیشۂ طبع کی کاوش زبانِ قلم رشکِ تیشۂ فرہاد ہے۔ کلامِ شیریں کی تلاش میں برباد ہے۔''(۸۴)

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے بھی اپنے تذکرہ گلشنِ بےخار میں شرر کی نازک خیالی کو خصوصیت سے بیان کیا ہے:

''شرر تخلص مرزا ابراهیم بیگ شاگرد نوازش حسین خان نوازش تخلص بنازك خیالی باخیال موزوں فن سخن از قانون سینه ترا ویدی ازوست شعر۔''(۸۵)

شرر کا نمونۂ کلام یہ ہے:

سامعیں کا نہ فقط سننے سے دم رکتا ہے
سرگذشت اپنی جو لکھیے تو قلم رکتا ہے(۸۶)

ایک غزل کے دو اشعار ہیں:

جھوٹی ہے محبت تم یاں کس کو جتاتے ہو
تقریر میں لکنت ہے کیوں باتیں بناتے ہو
شربت کے سے گھونٹ اب تو پیتے ہو شرر ہر دم
یوں اس شکریں لب کی اب گالیاں کھاتے ہو(۸۷)

ذکاء:

ذکاء اس عہد کے ایک نمایاں مرثیہ گو تھے۔ نام شیخ محمد مخدوم اور تخلص ذکاء تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور شاعری اور نوحہ خوانی میں نوازش کے شاگرد تھے۔ سعادت خان ناصر کے بقول:

''شیخ محمد مخدوم مرحوم ذکاء، نوحہ خوانِ جنابِ سید الشہداء ساکن لکھنؤ شاگردِ مرزا خانی نوازش۔''(۸۸)

سید محسن علی محسن نے سراپا سخن میں ذکاء کو نوحہ خوانی کا موجد قرار دیا ہے:

''موزون الطبع، خوش نوا، مرزا مخدوم بخش تخلص ذکاء موجد نوحہ خوانی شاگرد مرزا خانی من کلامہ۔'' (۸۹)

جب نوازش نے کانپور ہجرت کی تو دلگیر کی طرح یہ بھی ناسخ کے شاگرد ہو گئے اور ان سے اصلاح لیتے رہے۔

''میرزا محمد بخش، ذکاء تخلص جوان خوش تقریر و مهذب الاخلاق است و بمقتضای موزونی طبع چیزی که موزوں میکند آنرا برویّه میر سوز به نظرِ اصلاحِ مرزا خانی نوازش تخلص گزرانیده، دور ایامِ مهاجرت استادِ خود چندی به پیشِ شیخ امام بخش ناسخ هم کلام خود برده بزیورِ اصلاح عروسِ غزل را گلی ساخته۔ عمرش تخمیناً قریب چهل خواهد بود از انتخابِ بیاض اوست من رویه سوز۔'' (۹۰)

نمونہ کلام میں غزل کے یہ چند خوبصورت اشعار شامل ہیں:

یارب! کسی کے بس میں کسی کا نہ آئے دل
مجھ سے یہ اب کہا نہیں جاتا کہ ہائے دل
لہرا رہا ہے دل میں مرے نورِ حسنِ یار
خورشید سے فزوں ہے ہماری ضیائے دل
دل میرا ایک ناز ترے یار سیکڑوں
انصاف تو ہی کر کہ کہاں تک اُٹھائے دل
چارہ نہیں کسی کا کہوں کس سے اے ذکاءؔ
قسمت میں اس کی غم ہے لکھا کیوں نہ کھائے دل (۹۱)

نیّر:

اصل نام مرزا حسن عسکری، نیر تخلص، جبکہ عرف آغا جان تھا۔ والد کا نام مرزا مظفر علی بیگ تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کا یہ نمونہ کلام دستیاب ہوا ہے:

کس حسن کے ہیں اس بتِ پیماں شکن کے ہاتھ
ہیرے کی ہے کلائی عقیقِ یمن کے ہاتھ
عالم میں اس کے تیغِ نگہ سے نہیں پناہ
میدان قتل کا ہے اسی تیغ زن کے ہاتھ

سینہ ہمارا ناوکِ مژگاں سے چھن گیا
چورنگ دل ہوا ہے تیرے بانکپن کے ہاتھ
کس طرح ہم نہ دستِ تأسف سدا ملیں
آئے نہ ہاتھ اس بتِ پیماں شکن کے ہاتھ
پروانوں کے جلانے سے کیا فائدہ اسے
جز خاک، خاک آتا ہے شمعِ لگن کے ہاتھ
شانے سے تیری زلفوں کا کیا بل نکل گیا
قابو میں کس طرح ہوں اسیرِ رسن کے ہاتھ
ڈر ہے کہیں نہ جامۂ ہستی ہو تار تار
عادی ہوئے ہیں پھاڑنے میں پیرہن کے ہاتھ
اللہ رے شوقِ وصلِ صنم بعدِ مرگ بھی
ہیں فرطِ اضطراب سے باہر کفن کے ہاتھ
موڑا نہ منہ کو معرکۂ امتحان سے
ہمت نے چوم چوم لیے کوہ کن کے ہاتھ
نیرؔ یہی دعا ہے گلستانِ دہر میں
میرے گلے کے ہار ہوں اس گلبدن کے ہاتھ(۹۲)

منشی مہدی ملتمس:

منشی مہدی ملتمس بھی نوازش کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ بقولِ مصحفی:

"منشی مہدی ملتمس اس کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔" (۹۳)

منشی مہدی ملتمس کے کئی اشعار کی تضمین نوازش نے اپنے دیوان میں کی ہے۔

کلامِ نوازش کا فنی وفکری جائزہ:

وقت کی ستم ظریفی بہت عجیب چیز ہوتی ہے۔ نوازش نے جب اپنی ادبی اور شاعرانہ زندگی کا آغاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو میر سوز ایسا استاد عطا کیا، جس کو اُس عہد میں بھی اُس کا جائز مقام مل چکا تھا اور آج کے دور میں بھی تواریخ اور

تذکرے اُس کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ اِسی طرح جب نوازِش اپنے عروج پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے رجب علی بیگ سرور اور دلگیر جیسے شاگردان دیے، جن کو اس دور میں بھی وہ مقام مل چکا تھا، جس کے وہ حقدار تھے اور آج بھی اُن کے کارناموں کی چمک سے اُردو ادب جگمگا رہا ہے۔ اِس پس منظر میں جب ہم نوازِش کو دیکھتے ہیں تو سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ نوازِش کو آج تک وہ مقام نہ مل سکا، جس کے وہ حقدار ہیں۔ اُن کے استاد اور اُن کے شاگردوں کے فن اور کمالات سے تو ہم واقف ہیں، لیکن نوازِش کے معاملے میں ہم ابھی تک اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک نوازِش کے کلام کا جائزہ ہی نہیں لیا گیا اور نہ اُن محاسن پر نظر کی گئی، جو اُن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ نوازِش کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ نوازِش کا کلام اُس عہد کے نامور شعراء سے کسی طرح کم نہیں ہے اور اِس میں وہ تمام محاسن موجود ہیں، جن کی بنا پر کسی شاعر کو عظمت کی سند جاری کی جاتی ہے۔

کلامِ نوازِش کے فنی و فکری محاسن کا جائزہ پیشِ خدمت ہے:

ا۔ تصورِ عشق و صنم:

عشق کا تصور اردو شاعری کے آغاز سے کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔ ہر دبستان کی شاعری میں عشق کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چاہے یہ عشق، عشقِ حقیقی کی صورت میں ہو، چاہے عشقِ مجازی کی صورت میں۔ عشق کو یہ مقام کیوں ملا؟ اس بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''عشق انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ ایک فطرتی کشش ہے، جو دل میں ذوق اور کشش پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی انسان، چاہے وہ کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو، اپنی فطرت کی اِس احساسی حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اِس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے اور اِس کی منزلیں اتنی ہی وسیع ہیں، جتنی کہ کائنات۔ حسن کی قدر افزائی چراغِ عشق کی روشنی ہی میں ممکن ہے۔ بعض کے نزدیک: عشق، جو جذبے کی اندرونی حقیقت ہے، حسن پر فوقیت رکھتا ہے۔ حسن عشق کا محتاج ہے، لیکن عشق حسن سے بے نیاز ہے۔'' (۹۴)

ہر شاعر نے اپنی شاعری میں عشقیہ مضامین باندھے ہیں اور ان کو جدّت دی ہے۔ نوازِش کی شاعری بھی اس سے مبرّا نہیں ہے۔ نوازِش نے اپنی شاعری میں عشق کو بہت اہمیت دی ہے، لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نوازِش کا عشق، عشقِ حقیقی نہیں ہے، بلکہ مجازی عشق ہے۔ وہ مجازی محبوب پر عاشق ہیں اور اُس کے عشق میں ہر حد پار کرنے کو تیار رہتے

ہیں، جو لکھنوی عہد کا طرۂ امتیاز تھا:

''غزل گو شاعر عاشق ہوتا ہے اور عاشق کی ہر بات دنیا والوں سے الگ ہوتی ہے؛ اُس کا ہر انداز نرالا اور اُس کی ہر شان میں انوکھا پن ہوتا ہے؛ وہ دوسروں کی چلی ہوئی راہ پر نہیں چلتا، بلکہ اپنی الگ راہ نکالتا ہے، چاہے وہ سیدھی ہو، یا ٹیڑھی۔ اِس سے اُسے بحث نہیں۔'' (۹۵)

نوازِش کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوازِش کا تصورِ عشق عام شعراء سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ دیگر شعراء کے برعکس اُن کے کلام میں ہمیں عشقِ حقیقی کا تصور بالکل نہیں ملتا۔ اِس کی نمایاں وجوہات میں اُس عہد کا معاشرہ اور لکھنؤ کا دورِ عروج قابلِ ذکر ہیں۔ اُس عہد کی دہلی کو دیکھیں تو وہ بار بار اُجڑ رہی تھی۔ نادر شاہ افشار اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دہلی کو برباد کر دیا تھا۔ کچھ شعراء نے تصوف میں پناہ لی۔ خواجہ میر درد اور مظہر جانِ جاناں کی خانقاہیں اُس دور میں مرجعِ خلائق تھیں۔ عوام نے تصوف میں پناہ لی تو شعراء نے بھی عشقِ حقیقی اور تصوف کے مضامین باندھے۔ لکھنؤ میں ایسے حالات بالکل نہیں تھے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس عہد کی شاعری ہمیں حسن و عشق کے معاملات سے بھری ہوئی اور عشقِ حقیقی اور تصوف سے خالی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوازِش کی شاعری میں روایتی عشق کی کسک، سوز و گداز اور جاں سوزی کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نوازِش نے اپنے اشعار میں اپنے تصورِ عشق کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے:

بیمارِ عشق کا اگر آتا نہ تھا علاج
کس منہ سے اِس طرف تھا مسیحا نے مُنہ کیا؟

کسی جگہ پر وہ دل کے لگتے ہی یار کے جدا ہونے پر عشق کے شاکی ہیں:

دل کے لگتے ہی جُدا مجھ سے مرا یار ہوا
عشق کرنا مجھے اب کے نہ سزاوار ہوا

بعض جگہ پر وہ عشق کو گلے کا ہار بھی قرار دیتے ہیں:

سخت خواری ہے، ہُوا سوکھ کے کانٹا سا بدن
عشق اُس گُل کا، گلے کا یہ مرے ہار ہوا

اُن کے مطابق عشق بازی کا کھیل زر بازی کا کھیل ہے، جس کو صرف امراء اور صاحبِ ثروت افراد ہی کھیل سکتے ہیں۔ تھوڑے سے مبالغے کے ساتھ وہ یہ بھی کہنے سے نہیں چوکتے کہ اِس کھیل میں قارون کا خزانہ بھی صرف ہو جاتا ہے:

عشق بازی بھی جو سچ پوچھو تو زر بازی ہے
صَرف یاں ہو گا، جو گنجینۂ قاروں ہو گا

وہ عشق سے منکر نہیں ہیں، صرف کسی قابلِ عشق معشوق کے منتظر ہیں:

اِنکار نرا ہم کو نہیں عشقِ بُتاں سے
پر اپنی کوئی وضع کے قابل نہیں مِلتا

وہ خود کو عشق کی تہہ میں پہنچا ہوا قرار دے کر کہتے ہیں کہ ان کی طرح کوئی اور عشق کے بحر کے ساحل تک بالکل نہیں پہنچ پائے گا:

مجھ سا ہی کوئی عشق میں ڈُوبا ہو تو پائے
اس بحر کا ہر ایک کو ساحل نہیں مِلتا

کئی جگہ پر وہ عشق کو سومن کا بوجھ بھی قرار دیتے ہیں:

گِرا اِس سر پہ بارِ عشق، جیسے بوجھ سو من کا
سرِ دست آج جس صدمہ سے اک باری ڈھلا منکا

الغرض نوازِش نے اپنی شاعری میں عشق کا بھی اچھوتا تصور پیش کیا ہے اور اپنے محبوب کا بھی ایک الگ روپ پیش کیا ہے جو دیگر شعراء کے تصورِ حسن و جمال، بے رخی اور بے وفائی سے ہٹ کر بہت خونخوار ہے۔ اگر چہ یہ سب کچھ دیگر شعراء نے بھی پیش کیا ہے، مگر نوازِش نے اسے بہت منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔

۲۔خارجیت:

دبستانِ لکھنؤ کی نمایاں خصوصیت خارجیت ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دبستانِ دہلی کی پہچان ان کی داخلیت اور دبستانِ لکھنؤ کی پہچان ان کی خارجیت ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں میر سوز پہلے شاعر تھے، جنھوں نے خارجیت کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ میر سوز سے پہلے لکھنؤ میں جو شعراء تھے، وہ دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے، مثلاً: میر اور سودا وغیرہ۔ میر سوز بھی دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے، مگر اُنھوں نے بہت جلد لکھنوی رنگ اختیار کر لیا اور خارجیت کے رنگ میں رنگے گئے۔ ڈاکٹر سردار احمد خان کے مطابق:

> ''یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دہلوی شعراء میں سوز پہلے شاعر ہیں، جن کے ہاں داخلی کیفیات کے ساتھ خارجی اثرات بھی ملتے ہیں۔'' (۹۶)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے دبستان کے بہت سے امتیازات میں سے

ایک امتیاز خارجیت ہے۔

''لکھنؤ کے دبستانِ ادب کے ساتھ بعض خصوصی امتیازات وابستہ ہیں۔ اُن میں سب سے اہم شاعری میں خارجی پہلو کا بیان ہے۔''(۹۷)

نوازش، میر سوز کے شاگرد اور دبستانِ لکھنؤ کے نمایاں شاعر تھے، اس لیے ان کا کلام بھی خارجیت سے عاری نہیں ہے۔ اُنھوں نے بھی محبوب کے غم میں گھلنے کی بجائے اُس کے حسن کو ٹوٹ کر چاہا ہے اور اُس کے انگ انگ کو اپنے اشعار میں سراہا ہے۔ اُن کے کلام میں محبوب کی چولی، جامہ، حنا، مسّی، قبا، لب، مژہ، چشم اور رخساروں کا ذکر بہت کثرت سے ملتا ہے۔

ہے بُوئے وصلِ جاناں، رُسوائی کا شگوفہ
بستر کا ذِکر کیا ہے؟ سب گھر مہک رہا ہے

کس گلبدن سے لپٹا، اے شوخ! بے سلیقہ
چولی سمیت جامہ، سارا مسک رہا ہے

برنگِ دُزدِ حنا ہاتھ لگ گیا جو کبھی
کھلیں گی چوریاں دُزدیدہ اِن نگاہوں کی

کیونکر نہ ملوں ہاتھ سیہ بختی پر اپنی
مسّی ہوئی گٹ پس کے لبِ یار سے گستاخ

اُٹھ جائے تکلّف تو ابھی کھول کے آغوش
مانندِ قبا ہوں تنِ دلدار سے گستاخ

باعثِ شُبہ ہے تیرے تنِ نازک پہ قبا
بند تو کھول میاں! تیرے کمر ہے کہ نہیں؟

لبوں کی لالیوں سے جان کے پڑے لالے
دیا تھا کس مرے دشمن نے اُس کو پان لگا؟

کھینچ تیغِ چشم میں سرمہ نہ اِس انداز سے
بُوئے خوں آتی ہے اِس شمشیرِ خانہ ساز سے

سرمہ آلود مژہ نے تری یوں قتل کیا
جیسے شب خون کسی پر کوئی پلٹن مارے

دیدِ مژہ کو اس کی نوازش جگر ہے شرط
خوں ہی کہاں جو میں کروں نشتر کا سامنا

چشم و مژہ سے اُس کے جو آنکھیں لڑائیاں
دل چھید چھید صورتِ بادام ہوگیا

قند پھیکا ہو جہاں، واں کرو مصری کی نہ بات
ہے بھرا مُنہ میں مزا اُس کے لب شیرین کا

سنگ پانی کے بکیں مول نہ کیوں لعل و گہر؟
ہے عجب رنگ کا تیرے لب و دندان میں آب

دِکھا کر چشم کا ڈورا، سلائی پھیر دی اُس نے
مژہ دیکھا نا! تم نے انکھڑیو! آنکھیں لڑانے کا

جالی کا پیرہن یہ تنِ یار پر نہیں
دیکھو لگے ہیں دیدۂ اہلِ نظر تمام

۳۔فلسفیانہ مضامین:

نوازش کے کلام میں اگر چہ ہمیں فلسفیانہ مضامین اس کثرت سے نہیں ملتے، جس کثرت سے اس عہد کے دیگر شعراء کی شاعری میں ملتے ہیں، تاہم کلامِ نوازش کا دامن فلسفہ سے بالکل تہی نہیں ہے۔ اس میں ہمیں کئی جگہ پر بہت کمال کے مضامین ملتے ہیں۔

جُز اور کُل شاعری کا بہت عمدہ فلسفیانہ موضوع رہا ہے۔ نوازش کے خیال میں پانی کا بلبلہ، جب تک حباب ہوتا ہے، اس وقت تک وہ جُز ہوتا ہے، مگر جب وہ اپنی ہستی کو مٹا کر بحر میں غرق ہو جاتا ہے تو وہ جُز سے کُل ہو جاتا ہے۔ یوں اُس کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی، بلکہ اُس کی ابدی زندگی کا باعث بن جاتی ہے۔

بیٹھے تو بیٹھے اس طرح، ہوگیا دم میں جُز سے کُل
بحر میں جب حباب نے، اپنے تئیں کھپا دیا

اِسی خیال کوایک اور جگہ پر بہت عمدگی سے بیان کیا ہے:

رواروی پہ یہ عالم ہے اب جُز و کُل کا
نکلتی جاں ہے، سرِ دست لیتی ہے ہلکا

ہستی اور نیستی بھی عرصے سے بہت عمدہ فلسفیانہ موضوع رہا ہے۔نوازِش نے بھی ہستی یعنی 'ہے' اور نیستی یعنی 'نہیں' کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے، بلکہ اسے طلسم قرار دیا ہے۔

بزمِ بُتاں بھی ایک، نوازِش! طِلسم ہے
پیدا بھی 'ہے' نہیں سے ہے گُم بھی 'نہیں' سے ربط

نوازِش کے نزدیک ہستی ونیستی ایک ہی سکّے کے دورخ ہیں، اس لیے جولوگ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں، وہ کبھی نہیں مرتے، بلکہ قیامت تک زندہ رہتے ہیں۔

ہستی و نیستی ہے ایک سی یاں
اپنا تا حشر اِنتقال نہیں

نوازِش کے مطابق جولوگ ہستی کو نیستی نہ مانیں، وہ لوگ اہلِ کرم اور اہلِ جود نہیں ہوتے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہستی کو موجود نہ مانیں، بلکہ نیستی مانیں۔

حرکت کرتے یہ اہلِ کرم و جُود نہیں
تیری ہستی کو میں گِنتا کبھی موجود نہیں

انسان کی فانی زندگی کو پانی کے بلبلے، یعنی حباب سے تشبیہہ دی جاتی ہے، جوفوراً ہی بنتا ہے اور فوراً ہی مٹ جاتا ہے۔نوازِش نے کئی اشعار میں دریا کے آب پر حباب کی موجودگی کا حوالہ دیا ہے۔

دم بھر نہ ٹھہرے اُن کے یہاں جوں حباب ہم
گویا رواروی میں ہیں دریا کی آب ہم

ان کے خیال میں جتنی دیر میں حباب سر اٹھا کر دنیا کو دیکھتا ہے اور مٹ جاتا ہے، انسان کی زندگی کا سفر بھی کم وبیش اِتنا ہی ہے اور دم میں تمام ہو جاتا ہے۔

بحرِ فنا نہ دیکھا اُٹھا کر تھا سر تمام
مثلِ حباب ہو گیا دم میں سفر تمام

اس شعر میں بھی من وعن اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔

کچھ آنکھیں کھلتے ہی بحرِ جہاں میں مُوند لیں آنکھیں
حباب آسا مگر تھا دم ہُوا بہرِ فنا اپنا

ایک جگہ پرنوازش نے حباب کے مٹنے کو سر اٹھانے کی سزا قرار دے کر انوکھا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اُن کے مطابق جیسے ہی حباب کو اپنی ہستی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سر اُٹھا کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کو مٹا کر ہستی سے نیستی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

مِٹ گیا ایک دم میں مثلِ حباب
یاں ذرا جس نے سر اُٹھا دیکھا

کئی جگہ پرنوازش نے زندگی کو قیدِ ہستی اور دنیا کو زندان سے تشبیہ دی ہے۔

محبسِ دُنیا سے مجھ وارستہ کو کیا کام تھا؟
قیدِ ہستی نے [یہ] تھنب رکھا ہے اِس زِندان میں

اور کسی جگہ تو وہ خود کو صفحۂ ہستی پر حرفِ غلط قرار دیتے ہیں، جو بڑے سے بڑے نکتہ دان سے بھی نہ اُٹھ سکے۔

صفحۂ ہستی پہ وہ حرفِ غلط ہوں میں نحیف
جو اُٹھانے سے نہ ہر یک نکتہ داں سے اُٹھ سکے

نوازش بعض جگہ فلسفۂ وحدۃ الوجود کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مطابق وہ ایک ہی ہستی ہے، جو دنیا کی ہر صورت میں موجود ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھا کر دیکھے۔

ہے رشکِ سراب آہ! یہ آبادیِ دنیا
بس دُور ہی سے دیکھ قریب اُس کے نہ تُو جا
آنکھوں سے اُٹھا اپنے تُو غفلت کا تو پردہ
یک ہستیِ موہوم ہے کُل صورتِ اشیا
ہے دِیدۂ تحقیق میں جُز نامِ خدا ہیچ

اُن کے خیال میں اگر انسان عدم اور موجود کے فلسفے کو سمجھ جائے اور اپنی ہستی کو عدم جان لے تو اُس کو ابدی عمر

حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر وہ مرنے سے پہلے مرنے کا ہنر سیکھ لے تو وہ مرنے کے بعد بھی نہیں مرتا، بلکہ ابدی زندگی پا جاتا ہے۔

مرتا ہی نہیں مرنے سے جو پہلے ہی مر جائے
گر عمرِ ابد چاہے تو ہستی کو عدم سوچ

۴۔ مقامی اثرات:

نوازِش کو لکھنؤ سے عشق تھا جس کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ہوتا ہے۔ نوازِش نے لکھنؤ اور ہندوستان کے اثرات کو بہت زیادہ قبول کیا تھا۔ انھوں نے ان اثرات کو اپنی شاعری میں بھی بیان کیا ہے۔

پہلوان کشتی کے دوران ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر زور لگاتے ہیں، جس کو پنجہ کرنا کہتے ہیں۔ نوازِش نے اِس چیز کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

کیوں کروں پنجہ، نہیں پنجہ میں مجھ کو دستگاہ
ہاتھ توڑا چاہتے ہو تم مِلا کے ہاتھ سے

ہندوستان میں پُوس کا مہینہ کا نواں مہینہ ہوتا ہے، جو تقریباً ۱۵ر دسمبر سے ۱۵ر جنوری تک رہتا ہے اور اس مہینے میں شدید سردی پڑتی ہے۔ نوازِش نے اِس کو یوں بیان کیا ہے۔

دھوپ کس کی؟ کس کا بالا پوش؟ اُس کو لاؤ یاں
گرمیِ صحبت ہی سے جاوے گی سردی پُوس کی

لکھنؤ میں اُس زمانے میں لوگ بہت ضعیف الاعتقاد تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پریشان ہو کر جھاڑ پھونک کے لیے کسی سیانے کو بلاتے تھے۔

جھاڑ پھونک اپنی سُن اے رشکِ پری! جس نے نہ کی
کوئی بچ شہر میں ہم سے تو وہ سیانا نہ رہا

اُس دور میں ایک کھیل بہت مشہور تھا، جس میں ایک دوسرے پر پھول پھینکے جاتے تھے۔

ترا آنکھوں سے کہنا مانتے ہم
گُلِ بازی کو اُٹھوایا تو ہوتا؟

اِسی طرح ایک اور کھیل اُن دنوں بہت مشہور تھا، جس میں ایک دوسرے پر پانی پھینکا جاتا تھا۔

چھینٹے لڑنے میں عجب کل تو شگوفہ پھولا
سردیِ آب سے ہو گئے لب دِلدار کبود

لکھنؤ میں اُس دور میں مرغوں کی لڑائی بھی بہت مشہور تھی اور لوگ بہت شوق سے پال کر مرغوں کی لڑائی کرواتے تھے، جس کو جھڑ پانا کہتے تھے۔

دربانِ یار و غیر سے ہے دل میں خار خار
اِن مرغوں کو کسی طرح جھڑپا کے دیکھیے

ہولی کا تہوار ہندوستان میں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، جس میں اس دور میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی بھرپور حصہ لیتے تھے۔

غیروں پہ گُلال اُس نے جو ہولی میں اُڑایا
جُوں طائرِ وحشی، مرا غیرت سے اُڑا رنگ

اس دور میں کئی لوگ آپس میں بات چیت کے لیے ایک مصنوعی زبان اختیار کر لیتے تھے، جس کو زرگری کہتے تھے، اس کا مقصد سب کے سامنے آپس میں کوئی خفیہ بات کرنا ہوتا تھا۔

زرگری مت یہ سنا رے! کہ میں سمجھوں کیونکر؟
آج تک حرف یہ تہ دار، نہ دیکھا نہ سنا

ہندو لوگ اپنے گلے سے لے کر بغل تک ایک مقدس دھاگہ باندھتے ہیں، جس کو زنار کہتے ہیں۔

ڈور ہر بت پہ ہوں سر رشتۂ اسلام کو چھوڑ
جب سے عشقِ پسرِ صاحبِ زنّار ہوا

اُس عہد میں کسی بیمار کو صحت یاب کرنے کے لیے لخلخا استعمال کیا جاتا تھا۔ لخلخا چند خوشبودار چیزوں کا مجموعہ ہوتا تھا، جو تقویتِ دماغ کے لیے مریض کو سنگھایا جاتا تھا، جس سے وہ بہت جلد صحت مند ہو جاتا تھا۔

کاکُلِ عنبریں کی بُو، یاد میں کر جلوں نہ آہ!
مت مرے رُوبرو کرو بزم میں لخلخا طلب

۵۔ نئے مضامین

کسی بھی شاعر کی عظمت کا تعین اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاعری میں کتنے گھسے پٹے مضامین استعمال کرتا ہے اور کتنے نئے نئے موضوعات بیان کرتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اردو شاعری میں وہی چند روایتی مضامین ہیں، جو آج تک مستعمل ہیں۔ صرف ان کا بہتر استعمال ہی کسی شاعر کو عظمت کی سند عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بقول:

"دراصل کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا، جو اس کو دلنشیں انداز میں باندھ دے، وہ اُسی کا ہو جاتا

ہے۔"(۹۸)

نوازش کے عہد کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ نوازش کے عہد میں بھی وہی عامیانہ سے موضوعات تھے، جو ہر مشاعرے میں دہرائے جا رہے تھے۔ صرف زبان کی صفائی، الفاظ کی آرائش اور اندازِ بیاں سے ہی شعراء عظمت کی سند پا رہے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے میں:

"مضمون کے اعتبار سے لکھنؤ کے سرآمد شعراء کا بیشتر کلام ادنیٰ درجے کا ہے، لیکن ان کے کمال کا اصلی جوہر ان کی زبان ہے۔"(۹۹)

نوازش بہت ندرت پسند شاعر تھے۔ انھوں نے بہت ہی انوکھے اور نئے مضامین اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں، جو اس عہد کے اور کسی شاعر کے کلام میں دکھائی نہیں دیتے۔

دل کے قرضے کی تو نالش میں ابھی تجھ پہ کروں
خوف ہو سازشِ حاکم سے نہ گر ڈِسمِس کا

منگوا بھی گنجفہ، نہ قُماشِ سخن پہ جا
شطرنج تو نہیں یہ، جو ہو مات کا خیال

واللہ! دل سخت میاں! شور زمیں ہے
برباد عبث کرتے ہیں یاں تُخمِ اہل ہم

جوں مغزِ طسوس ان کا الٰہی! ہو سیہ مُنہ
ہوتے ہیں جو لے لینے سے ہی نامِ درم تلخ

دیکھیں! گُل ٹھہرے گا کب تک فرسِ صرصر پر؟
توسنِ ناز کی مت باگ گلستاں سے اُٹھا

اے دل! نہ کیجیو بُتِ کافر کا سامنا
شیشے ہی کی شکست ہے پتھر کا سامنا

نہ کِیا، شُکر، دمِ گرم نے محتاجِ غیر
میں نے ققنس کی طرح آگ لگا دی تن کو

خُود فروشی کرتی ہے بے قدر جنسِ حُسن کو
میرے یوسف! چھوڑ دے تُو، بیٹھنا بازار کا

ماہِ مِصری کا ہو بڑھیا کے سے کاتے کا بہا
میرے یوسف کو نہیں گرمیِ بازار پسند

۶۔رعایتِ لفظی:

نوازِش کے دور میں شاعری رعایتِ لفظی کا دوسرا نام بن چکی تھی۔ ہر شاعر الفاظ کی نقاشی اس انداز سے کرتا تھا کہ ایہام کے رنگ بھی پھیکے پڑ جاتے تھے۔ رعایتِ لفظی اگرچہ دہلی کے شعراء میں بھی موجود تھی، مگر لکھنؤ میں اِس کو چار چاند لگ چکے تھے اور اُس نے دبستانِ لکھنؤ میں اپنا خاص مقام بنا لیا تھا۔ ابواللیث صدیقی کے مطابق:

''لکھنویت کا ایک اور اہم عنصر صنعت گری ہے، جس کے شوق میں لکھنؤ والوں نے رعایتِ لفظی اور ضلع جگت میں کمال پیدا کیا۔ لکھنؤ کے بعض اچھے اچھے شاعروں کو اسی شوق نے بدنام کر دیا۔'' (۱۰۰)

ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے بھی اِس بات کی تائید کی ہے کہ اُس دور میں رعایتِ لفظی کی صنعت سب سے زیادہ عروج پر تھی، جس سے میر انیس جیسے عظیم شاعر بھی دامن نہ بچا پائے۔

''لکھنؤ میں اِس صنعت نے سب سے زیادہ فروغ پایا۔ لفظوں کی سحر کاری کے پہلو بہ پہلو لفظوں کی شعبدہ بازی بھی بہر حال پھلتی پھولتی رہی۔ لکھنؤ میں یہی ہوا۔ یہاں شاعری لفظوں کا کھیل بن کر رہ گئی۔ اِس رجحان نے ایسا زور باندھا کہ انیس جیسا بلند مرتبہ شاعر بھی اِس سے دامن نہ بچا سکا۔ کسی صاحبِ نظر نے اس خامی کی طرف متوجہ کیا تو ان کا جواب تھا کہ: کیا کروں لکھنؤ میں رہنا ہے۔'' (۱۰۱)

نوازِش ایہام گو شاعر نہیں تھے، لیکن وہ اپنے کلام میں الفاظ کو اس خوبصورتی سے پیش کرتے تھے کہ ایہام کا گمان ہونے لگتا تھا۔ اُن کے کلام میں ہمیں رعایتِ لفظی کے بہت اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

کس ادا سے یہ کہا، موت نے گھیرا ہے تجھے
میں نے کُوچے میں کھڑا اُس کو جو کل گھیر لیا

لے زرِ نقد دل، اُس نے کہا، سیسے کا ہے، لو
ہاتھوں ہی ہاتھ نوازِش! یہ اُلٹ پھیر کیا

ہے پلنگ پیکر آہ! کاٹتا پلنگ اُس بن
بان سا ہے لگتا بان مجھ کو چارپائی کا

حقیقت میں کمر ہے رشکِ مُو یا وہم اپنا ہے
میاں! تُو کھول تو دو اِک ذرا بندِ قبا اپنا

واں یہ بندھی ہے اپنے دمِ سرد کی ہوا
لُو کا خواص رکھتا ہے جھونکا نسیم کا

یہی تو زخمِ پنہاں جڑ کے ہم لوگوں کے سینہ میں
ہنساتا ہے، رلاتا ہے، رلاتا ہے، ہنساتا ہے
یہی تو بے کلی سے عاشقوں کو دم میں سو باری
اُٹھاتا ہے، بٹھاتا ہے، بٹھاتا ہے، اُٹھاتا ہے

اب کِسے خوار کِیا چاہتے ہو اُلجھا کر
گُل سے مُکھڑے پہ جو لائے ہو یہ تم خار نکال

قابو یہ چڑھ گیا وہ کڑے ہوتے ہی مرے
کیا خیر، دیکھیو تو محبت کے شر میں ہے

ترا ہی چاک جو چکر میں ہر گھڑی رہتا
مری ہی خاک نہ ہو اے کُلال! اِس میں بھی

منزلِ وصلِ یار کیا، مُلکِ عدم سے ہے پرے؟
اپنا وِصال ہو گیا، پہنچے نہ پر وِصال کو

۷۔ سادگی وسلاست:

اگر ہم رجب علی بیگ کی نثر کو دیکھیں تو ہمیں مسجع اور رنگین الفاظ کی حسین کہکشاں دکھائی دیتی ہے۔ اس سے

گمان ہوتا ہے کہ شاید ان کے استادنوازِش بھی اسی روش کے پیروکار ہوں گے اور ان کا کلام بھی گنجلک اور پیچیدہ الفاظ کا ایک گورکھ دھندہ ہوگا، لیکن کلامِ نوازِش کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں بہت حیرت ہوتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ نوازِش نے اپنے کلام میں نہایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔

گھر میں ترے گودا کوئی یوں دھم سے نہ ہو گا
جو ہم سے ہوا فعل، وہ رستم سے نہ ہو گا

آج تکیے کی جگہ لیجیے شمشیر سے نیند
اب اگر آوے تو آوے اِسی تدبیر سے نیند

یہ حُسن و ملاحت پر اِتنا گھمنڈ؟
یہ دو دن کی دولت پر اِتنا گھمنڈ؟

اِس قدر گھبرا گیا مجھ کو مسیحا دیکھ کر
جو دوا اُس نے پلائی، اِستخارہ دیکھ کر

چاروں طرف سے موردِ الزام ہو گیا
میں اُس کی دوستی میں تو بدنام ہو گیا

سبزۂ خط نہ رکھو پُھول سے رُخساروں پر
رکھتے کانٹے نہیں ہر باغ کی دیواروں پر

۸۔شوخی وشرارت:

نوازِش کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ نہ تو نوازِش کی زندگی میں زیادہ رنج وآلام آئے اور نہ ہی وہ دور پرآشوب تھا، جس میں نوازِش نے جنم لیا۔ اس کا نتیجہ اُس شوخی، بانکپن اور ظرافت کی صورت میں نکلا، جو نوازِش کے کلام میں ہمیں جابجا نظر آتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

کی اُس کی جو تلوار کی تعریف تو بولا
ایسی ہی پسند آئی ہے تو آن کے کھا لے

لگا وہ ہنس کے یہ کہنے، جو رو دیا میں نے
اے! یہ گھر ہے مرا، مجلسِ امام نہیں

اب کے معشوقوں کا کچھ ہرگز نہ کیجے اعتبار
ساتھ ہر وقت اِن کے رکھنا، یک نگہباں چاہیے

یوں ہی اللہ کرے مُوجدِ فانوس جلے
بیر اُس نے کِیا اِس پردے میں پروانے سے

۹۔ تشبیہات واستعارات:

تشبیہات و استعارات کا استعمال نظم، یا نثر کو خوبصورت بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

''ہر استعارہ دوہرا مطلب رکھتا ہے۔ ایک کی جگہ دو تصور ذہن کے سامنے آتے ہیں، لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ رہتی ہے، جو شبوتی حقیقت اور تأثر دونوں پر حاوی ہوتی ہے۔ استعارے سے صرف ایک تأثر دوسرے میں تبدیل نہیں ہو جاتا، بلکہ اس میں قوت اور تازگی پیدا کر دیتا ہے۔'' (۱۰۲)

اس عہد میں شعرائے لکھنؤ اپنے کلام کو پر اثر بنانے کے لیے اپنی ساری قوت تشبیہات و استعارات کے استعمال میں صرف کر دیتے تھے۔ بقولِ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

''شعرائے لکھنؤ نے اپنی ساری قوت شعر کو ظاہری حسن و خوبی سے مزین کرنے میں صرف کر دی۔ تشبیہہ بھی اس قبیل کی چیز ہے۔'' (۱۰۳)

نوازِش کے کلام کی خوبصورتی میں ویسے تو کلام نہیں ہے، لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں بہت لاجواب تشبیہات اور استعارات استعمال کیے ہیں، جن سے کلام کا حسن اور بڑھ گیا ہے:

میری چالاکی سے چھل بل جب نہ پیش اُس کی گئی
چوکڑی بھولا ہوا مجھ کو ہرن یاد آ گیا

سنتے ہی ذکرِ صنم، اور لگی آتشِ عشق
واقعی آگ بھڑک اُٹھتی ہے سلگانے سے

زلفیں یہ نہیں حلقہ فگن مکھڑے پر اُس کے
دو، گرد ہیں میرے مہ تابان کے ہالے

میں دل سے کاسۂ چینی کو دوں گا تب نسبت
پڑیں گے صاحبو! جب لاکھ بال اِس میں بھی

شبِ تاریک میں رکھ رخنۂ دیوار پہ مُنہ
نظرِ طنز سے کرتا ہے نگہ تاروں پر

جُوں شمع کاہِ پردۂ فانوس دے جلا
پُھونکا ہے دل نے یُوں مرے تن کا نگر تمام

دیکھ اُس چشمِ سیہ مست کو یوں جُھک گئے ہم
جس طرح سے کسی افیونی کو پینک ہووے

کوئی دیوار، بے برسات جیسے بیٹھ جاتی ہے
کچھ اُس کوچے میں یوں ست چھوڑ کر میں ناتواں بیٹھا

شب پسینا گرا اُس رخ سے بہ ایں آب و تاب
جیسے جاتا ہے فلک پر سے کبھی اختر ٹوٹ

لیتا ہے دِل کو یوں وہ بُتِ کج کُلاہ لوٹ
دِلّی کو لے گیا تھا کبھی جیسے شاہ لوٹ

تیرِ باراں کیا یوں روک کے اُس نے مجھ کو
لیوے مینہ جیسے کسی کو کبھی میدان میں گھیر

۱۰۔ تلمیحات واشارات:

تلمیحات سے مراد وہ تاریخی واقعات وشخصیات ہیں، جن کا ذکر شاعر اپنے کلام میں کرتا ہے۔ نوازش نے اپنے

دیوان میں تمام قابلِ ذکر تلمیحات استعمال کی ہیں، جن کی تفصیلات کچھ یوں ہے:

ابوالبشر۔ حضرت آدم:

پہنچ او شوخ گندم رنگ! میرا دم نکلتا ہے
تری اِس شیطنت سے، خُلد سے آدم نکلتا ہے

اُسی کے ہونے سے تو فتنۂ زمانہ ہوا
نہ ہوتا کاش کے لڑ کے، ابوالبشر پیدا

آخرش ہم وہ مِلے آدم و حوّا کی طرح
لعن یاں غیر پہ کی، واں گئی شیطان پہ ٹھہر

حضرت یعقوب / پیغمبر کنعان:

حضرت یعقوب حضرت یوسف کے والد تھے۔ آپ کا وطن کنعان تھا۔ جب حضرت یعقوب، حضرت یوسف سے بچھڑ گئے تو رو رو کر نابینا ہو گئے تھے:

چشمِ یعقوب میں کیونکر نہ گڑھے پڑ جاتے
نورِ عین اُس کا رکھا تھا چہِ کنعان میں گھیر

وِلا! نہ چاہ، اگر نورِ دیدہ بھی ہووے
اِسی نے حضرتِ یعقوب کو بصیر کیا

حضرتِ یعقوب کو ہوں کیوں نہ یکساں رات دن
سچ ہے نورِ عین بن دیتا ہے دِکھلائی کہاں؟

حضرت یوسفؑ:

حضرت یوسف کے قصے کو احسن القصص کہا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں یہ قصہ موجود ہے۔ حضرت یوسف بے انتہا حسین تھے، جس کی وجہ سے ان کے بھائی ان کے دشمن بن گئے اور انھوں نے حضرت یوسف کو کنویں میں پھینک دیا۔ کنویں سے نکل کر آپ کو بازار میں بکنا پڑا اور ایک بوڑھی عورت نے ان کی معمولی قیمت لگائی۔ اس قصے کے حوالے سے نوازِش نے کئی تلمیحات بہت خوبصورتی سے استعمال کی ہیں:

ہم پلّہ کِیا یوسفِ کنعاں سے تو اُس نے
میزانِ خرد میں مرے پاسنگ نکالا

نامِ یوسف سُن عزیزو! جی نہیں ڈوبا مرا
خُلد میں اپنا مجھے بیت الحزن یاد آ گیا

سنا یوسف کو حسینانِ جہاں بھی دیکھے
تجھ سا بے مثل طرحدار نہ دیکھا نہ سنا

طوفانِ نوح:

حضرت نوح اللہ کے نبی تھے۔ آپ کی بددعا سے آپ کی قوم پر طوفان کا عذاب نازل کیا گیا:

طوفانِ نوح، دیکھیو تو مات ہے یہاں
یا رب چہ چشمہ بود محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

لحنِ داؤدی:

حضرت داؤد اللہ کے نبی تھے۔ آپ کو اللہ نے معجزے کے طور پر بہت خوبصورت آواز عطا کی تھی:

جور کو انداز سمجھے، مہربانی ناز کو
لحنِ داؤدی سدا سمجھے تری آواز کو

زلیخا:

زلیخا حضرت یوسف کے قصے کا ایک اہم کردار ہے۔ زلیخا عزیزِ مصر کی بیوی تھی، جس نے حضرت یوسف سے عشق کیا تھا اور یہ عشق آج تک شہرت رکھتا ہے:

کیا زُلیخا نے رکھا چاہ میں مردانہ قدم
کھینچے صفحۂ دل پر اُسی زن کے اوصاف

جہاں پہ عشقِ زُلیخا بھی پانی بھرتا تھا
کئی دِنوں میں یہ دھومیں تھیں اپنی چاہوں کی

حضرت موسیٰ کا عصا۔ کوہِ طور:

حضرت موسیٰ کوہِ طور پر اللہ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے منع فرمایا، پھر کوہِ طور پر اپنے نور کی ایک معمولی سی تجلی پھینکی، جس سے حضرت موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ اس تلمیح کو نوازِش نے اپنی شاعری میں بار بار استعمال کیا ہے:

روز ہی جھمکا نظر آتا ہے موسیٰ مجھ کو یاں
اپنے تو نزدیک بامِ یار، کوہِ طور ہے

آتش سے دل کی، طُور کے شعلہ پہ حرف ہے
تشبیہ دے نہ اِتنی بھی اُس کو شرر سے تُو

تاب نظارہ نہ لایا آخرش ناکردہ کار
تھا بہت موسیٰ کو اپنی لن ترانی پر گھمنڈ

حضرت خضر:

حضرت خضرؑ کو بعض روایات کے مطابق آبِ حیات مل گیا تھا، جس کو پی کر وہ قیامت تک زندہ رہیں گے۔

میں پیاسا ہوں خضر، آبِ تیغِ نگہ کا
گلے سے فرُو آبِ حیواں نہ ہو گا

چہرے نے داغ چاند کے مُنہ کو لگا دیا
خط نے ترے ہے خضر کو آبِ بقا دیا

بہ ایں خروارِ عمر اے خِضر! مرتا ہے تُو جینے پر
پسا جاتا ہوں میں، یہ بوجھ تو ہے میرے خِرمن کا

حضرت عیسیٰ مسیح:

حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ وہ بیماروں کو شفایاب کر دیتے تھے اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے:

نسخہ نویس ہے مطبِ یار کا مسیح
عطّار ہے شفائی، ہمارے حکیم کا

بـــہ عـــلاجـــم مسیـــح نـــاچـــار اســـت
دوستـــــاں آہ ایـــں چـــــہ آزار اســـت

پئہ درد ہے وہ، اُس کو لاؤ جائے عِلاج
مرے مسیح کو معلوم ہے دوائے فِراق

آئینۂ سکندری:

یونان کے بادشاہ سکندر کے پاس ایک بہت ہی قیمتی آئینہ تھا، جس میں وہ ہر چیز دیکھ سکتا تھا:

آئینہ دیکھ، سکندر کو ستائیں برعکس
عکس سے اپنے یہ عالم ہے بتِ خُود بیں کا

تیرے شوقِ عکس میں ہو جائے وہ بھی آئنہ
کھینچ کر رکھے اگر تُو سدِ اسکندر مجھے

سدِ سکندری:

سکندر نے یاجوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے ایک فولاد کی دیوار بنائی تھی، جس کی مضبوطی ضرب المثل ہے:

دلِ آئینہ رُخاں سخت ہے، فولاد ہے آہ!
میرے نالے سے تو جاوے سدِ اسکندر ٹوٹ

رستم:

رستم فارسی کے شاعر فردوسی کی شہرۂ آفاق کتاب شاہنامۂ فردوسی کا ہیرو، جو بہت بہادر اور طاقتور تھا:

گھر میں ترے گودا کوئی یوں دھم سے نہ ہو گا
جو ہم سے ہوا فعل، وہ رستم سے نہ ہو گا

لیلیٰ مجنوں/قیس مجنوں:

قیس عرب کے ایک قبیلے بنی عامر کے سردار کا بیٹا تھا، جو لیلیٰ کے عشق کی وجہ سے مجنوں کے لقب مشہور ہوا تھا:

پہچاننے سے رہ گئی جس وقت چشمِ قیس
تب سُوئے دشت، کہتے ہیں لیلیٰ نے مُنہ کیا

نوازِش! پاؤں تیرے چُومتا قیس، آج اگر ہوتا

زمینِ وادیِ وحشت کو تُو نے کیا لتاڑا ہے

قیس کے بارِ محبت نے وٹھایا ناقہ
نہ تو محمل ہی تھی، نے صاحبِ محمل بھاری

شیریں فرہاد:

فرہاد ایران کا باشندہ تھا، جو شیریں نامی عورت پر فدا تھا۔ بادشاہ خسرو کے کہنے پر اس نے پہاڑ کو چیر کر دودھ کی نہر نکالی، مگر بعد میں شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر سن کر اپنے آپ کو تیشہ مار کر خود کشی کر لی:

کھود کھود آہ مُوا، کوہ کو یوں ہی فرہاد
آخرش کام ہُوا ایک تبر میں دیکھو

کسی کے دل میں پیدا راہ کرنا ہے بڑا کرتب
کِیا فرہاد نے بے جا، جو جُوئے شیر پیدا کی

بوسوں ہی سے لعلِ لبِ جاں بخش کے فرہاد
یاں آب ہے شیریں بہ تہہ سنگ نکالا

مانی و بہزاد:

مانی و بہزاد ایران کے دو مشہور مصور تھے۔ انھوں نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا:

خوردہ بینی میں بھی دھوکے کی ہے رکھی ٹٹی
قد مرا اُس کا جو مانی نے برابر کھینچا

کھینچتا مانی و بہزاد سے دُور اپنے کو ہوں
جب سے نقشہ ہے ترا صفحۂ دل پر کھینچا

مانی ہیں اُس کے ہم غرضی بات چیت کے
مت رنج کھینچ، یاں نہیں تصویر سے غرض

قارون/گنجینۂ قارون:

قارون ایک دولت مند انسان تھا۔ وہ اپنے خزانے کے لیے مشہور ہے۔ اس کے خزانوں کی چابیاں کئی اونٹوں

پر لدی ہوتی تھیں۔ دیگر شعراء کی طرح نوازش نے بھی قارون کی تلمیحات استعمال کی ہیں:

عشق بازی بھی جو سچ پوچھو تو زر بازی ہے
صَرف یاں ہو گا، جو گنجینۂ قاروں ہو گا

تسبیحِ سلیمانی:

تسبیحِ سلیمانی سے مراد حضرت سلیمان کی تسبیح، یعنی بہت انوکھی تسبیح ہے۔

جب رہا دیدۂ عُشاق نِکلوا کے ہے شوخ
ہُوئی مُدّت میں یہ تسبیحِ سُلیمانی جمع

۱۱۔ فارسی الفاظ وتراکیب:

نوازش فارسی زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ اس دور کے تمام شعراء فارسی زبان پر قادر تھے۔ نوازش کے کلام میں بھی ہمیں بہت کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں، جن میں فارسی الفاظ اور تراکیب کا بے تکلفی سے استعمال کیا گیا ہے:

چراغ پاؤں ہو کیا مجھ سے قحبۂ دنیا؟
اِس اسپ مادیہ کو، میں نے ہے دیا جھلکا

بہ رکاب ابلقِ ایام کا ٹانگھن دیکھا
اِس پہ جمتے نہ کسی کا کبھی آسن دیکھا

دِکھائی دُخترِ رز آج کیا ہے اُس نے جوبن پر
عذابِ توبہ بشکستن ہے سب مِینا کی گردن پر

اِستقامت کی دِلا! گوں نہیں ہر چند فلک
خیر، کچھ روز کو یہ گُنبدِ کاواک نہ چھوڑ

حضورِ یار وہ ہرچند مجھ پہ عُزّ اویں
کروں نہ ضِد سے رقیبانِ زِشت خُو سے گریز
جب اپنی شیرِ غمِ ہجر سے نہ جھپکی آنکھ
تو کوئی کرتے ہیں خوفِ سگانِ کُو سے گریز

گھر میں اپنے جو نشست اُس بتِ عیار کی تھی
خُوئے دُزدی زبس اِس طبعِ ہوس کار کی تھی

نوازش کے دیوان میں ہمیں ایسے بہت سے تکڑے ملتے ہیں، جن کا پہلا مصرع اردو، جبکہ دوسرا اور تیسرا مصرع فارسی کا ہوتا ہے:

طفلِ مکتب تھا یہ، دم میں آ ہوا ہے کیا خراب
مہربانی ہای لیلیٰ کرد مجنوں را خراب
ورنہ ایں بیچارہ را میلِ گرفتاری نبود

ان کے بہت سے مخمسات میں بھی چوتھا اور پانچواں مصرع فارسی کا ملتا ہے:

گاہے میرے لب پر ہے فریاد کبھی افغاں
بارے غمِ دوری سے ہوں سخت میں اب نالاں
یہ جائے ترحم ہے، کر رحم ذرا او میاں[؟]
در زاویۂ الفت دور از تو چو مہجوراں
تنہا منم و آہی آہ از غمِ تنہائی

اس کے علاوہ ان کی غزلیات میں بعض اوقات پہلا مصرع، کئی دفعہ دو مصرعے اور بعض دفعہ تو پوری پوری غزل فارسی کی ملتی ہے:

بہ علاجم مسیح ناچار است
دوستاں آہ ایں چہ آزار است
بہ شبِ وصل شکوہ ہا چہ کنم
شبِ کوتاہ و قصّہ بسیار است
مانعِ نالہ می شود صیاد
چہ کنم آہ سخت دشوار است
اثرِ نسخہ نیستم بنگر
لرزہ بر عضو عضوِ عطار است
دفعتاً گرمِ اختلاط مشو

رشکِ عیسیٰ مزاجِ من حار است
خبرِ مرگِ من بہ او مکنید
ایں بشارت برای اغیار است
شدہ است ایں کہ رشک رشتۂ کاہ
می شناسی نوازِش زار است

ہمیں اس کے علاوہ نوازِش کے دیوان میں رستم، شیریں فرہاد، جامِ جم، بہزاد اور مانی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ نوازِش فارسی زبان و ادب پر پوری طرح قادر تھے اور اس سے متاثر بھی تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری فارسی الفاظ اور تراکیب سے بھری پڑی ہے۔

۱۲۔ابتذال:

نوازِش نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ فارغ البالی اور ہوس پرستی کا دور تھا؛ طوائف کو معاشرے میں بنیادی اہمیت حاصل ہو چکی تھی اور امرد پرستی کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا؛ مال و دولت کی کثرت نے معاشرے کو عیاش بنا دیا تھا۔ شاعری بھی اس سے نہ بچ سکی۔ شاعروں نے شاعری کو ہوس اور پھکڑ پن کا مرقع بنا دیا۔ جرأت کی شاعری اس بات کی گواہ ہے۔ شاعر عریاں سے عریاں مضامین بہت فخر سے بیان کرتے تھے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق:

''چند مستثنیات کے سوا لکھنؤ کی غزل میں رکاکت و ابتذال اور نسائیت اور بے حیائی کے عنصر کی اتنی بھر مار ہو گئی کہ اس نے لکھنوی شاعری کو بالکل عریاں کر دیا۔ بعض لکھنوی شاعروں نے غزل کو ہزل بنا دیا۔'' (۱۰۴)

نوازِش کا کلام بھی اِس ہوس پرستی اور پھکڑ پن سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے بھی بہت کھلے الفاظ میں ہوس پرستی کے مضامین اپنی شاعری میں باندھے ہیں:

اُس سبزۂ رخسار کے بوسوں کا ہوں عادی
چکھ جاؤں گا میں صاف، ضرر سم سے نہ ہو گا

مُوئے سو تشنۂ دِیدار جس کے چاہِ غب غب پر
الٰہی! خیر کچھ، اب ہے میرا دانت اُس لب پر

جو مانگا بے حیائی کر کے بوسہ
اِسی پر کچھ تُو شرمایا تو ہوتا؟

سوالِ بوسہ پہ خالی نہیں ہے لُطف سے ہائے!
تُھتھا کے مُنہ کو پھرانا گھڑی گھڑی اُس کا

مونھہ کو لا پاس، الگ کھینچ لیا سو سو بار
تم نے بوسہ بھی دیا مجھ کو تو سِسکا سِسکا

حقیقت میں کمر ہے رشکِ مُو یا وہم اپنا ہے
میاں! تُو کھول تو دو اِک ذرا بندِ قبا اپنا

اس سے پتا چلتا ہے کہ نوازِش نے اس عہد کے لکھنؤ کی صحیح عکاسی اپنے اشعار میں کی ہے اور خیالی، یا تصوراتی مضامین باندھنے کی بجائے ہوس پرستی اور عامیانہ پن کے مضامین بھی کثرت سے باندھے ہیں، جو اُس دور میں رائج تھے اور پسندیدگی کی نظر سے بھی دیکھے جاتے تھے۔

۱۳۔ انشائیہ اور مکالماتی انداز:

نوازِش کے کلام میں ہمیں بہت سی جگہ پر ان کا انداز شاعرانہ سے زیادہ انشائی اور مکالماتی دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے وہ شاعری نہیں کر رہے، اپنے سامنے بیٹھے کسی شخص سے بات چیت کر رہے ہیں:

قِبلہ! رُخصت کرو نوازِش کو
قابلِ صحبتِ جناب نہیں

کوچۂ جاناں اگر ٹھہرا ہے جنت دوستو!
ہے نمونہ دوزخ اپنے سینۂ سوزان کا

ترا شیخ! ہووے یہ رُو سیہ، ذرا آئینہ میں تو دیکھ مُنہ
تجھے کرنا اِس سن و سال پر، بھلا زیب دیتا خضاب تھا؟

۱۴۔ محاورہ بندی:

محاورات کا استعمال زبان کو خوبصورت اور قابلِ توجہ بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ محاورات سے ہی زبان سادہ اور سلیس بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کا حسن بھی بڑھ جاتا ہے۔ نوازِش نے اپنے کلام میں بہت سے محاورات اور ضرب الامثال استعمال کی ہیں، جس سے ان کی شاعری کی فصاحت اور روانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دیوانِ نوازِش میں موجود

سیکڑوں محاورات میں سے چند ایک پیش ہیں:

آنکھ چرانا:

نوازشؔ! روزِ اوّل سے چُرائی آنکھ تھی اُس نے
نہیں جرمِ نگہ اُس کا، گنہ ہے میری چتون کا

انٹی کرنا:

دیکھتے دیکھتے یوں دل کو ہے انٹی کرتا
جوں اُلٹ پھیر معاً شُعبدہ گر کرتے ہیں

بات کا بتنگڑ بننا:

ناگفتہ بہ ہی ہووے بتنگڑ نہ بات کا
بس چپ رہو، بڑھاؤ نہ کوئی کِسو کی بات

بات نکالنا:

میں اُس سے بات بھی کرتا نہیں ہوں اِس ڈر سے
نکالے بات نہ کچھ بدخصال اِس میں بھی

بے دست و پا:

لڑھتے پڑتے جو نشے میں وہ مرے پاس آ گیا
ہے یہ طفلِ اشک کی بے دست و پائی کا اثر

بیل منڈھے چڑھنا:

چڑھے یہ بیل منڈھے کب، ہے اِبتدائے عشق
ابھی سے سوچ رہا کچھ مآلِ کار ہوں میں

ٹسوے بہانا:

کیا مرے حال پہ ٹسوے جو بہے محفل کے
سوزِ غم سے نہ وہی آہ! ذرا جب ٹسکا

ثمر پانا:

سرو قد بھی کریں تعظیم یہاں تو جوں سرو

نہ ثمر پائے گا تو، اِن کی مدارات سے دل!

چراغِ سحری:

پھٹتے ہی گریبانِ سحر کے، سفری ہوں
اِس بزم میں، میں رشکِ چراغِ سحری ہوں

چنپت ہونا:

یہ میرا دلرُبا، میں اُس کا عاشق
تُو چنپت ہو، مرے دل کا لگا دل

حشر برپا ہونا:

کیا عجب، گور سے نکلیں جو کفن پھاڑ کے لوگ
حشر برپا تری رفتار سے ہے زیرِ زمیں

خاک چھاننا:

نہ مجھ سا پاؤ گے، چھانو جو خاکساری تم
میں خاکدانِ جہاں میں وہ خاکسار نہیں

خاک میں ملنا:

خاک میں مِل گئے دِلا! اب تو
اب ہے ناحق ہوس صفائی کی

دل کڑا کرنا:

جی میں ہے کڑا کر کے دل اُس سے یہ میں پوچھوں
باریک، مِیاں! کیوں ہے تمھاری کمر ایسی؟

دیدے کا پانی ڈھلنا:

اُس سے ہم چشمی ہے اس آنکھ پہ کرتی یہ نظر
پانی دِیدے کا ہے کیا ڈھل گیا اس نرگس کا؟

رال ٹپکنا:

نمکیں حُسن پہ حسینوں کے

کب ٹپکتی اُنھوں کی رال نہیں

سر چڑھنا:

زُلف اُس کی کیا بلا تھی جو سر چڑھتی وہ مرے
یارو! یہ کس کا میں نے خدا جانے مُنہ کیا

غصہ تھوکنا:

آیئے، بیٹھیے، بس تُھوکیے غُصہ حضرت!
خفگی آپ سے کچھ مجھ کو نہیں، جنگ نہیں

کال پڑنا رکال ہونا:

دے نہ آرام شامِ زُلف میں تُو
شبِ تیرہ کا بھی تو کال نہیں

کالے کوسوں دور:

بھاگتا زُلف سے ہوں اُس کی میں کالے کوسوں
سانپ تک بلکہ یہاں سیکڑوں فرسنگ نہیں

کام تمام کرنا:

کامِ جاں، بوسۂ لب دے کے کرے گا وہ تمام
دھیان یہ بھی رہے، خیر! اب تو دِلا! کار نکال

لو کا لگنا:

کرتی ہے پتنگے کو جلا نام تُو روشن
لُو کا لگے اے شمع! تری ناموری پر

مٹی خراب ہونا:

کیوں نوازش کی نہ مٹی آہ! پھر ہووے خراب
خاک میں ظالم! مِلا دی تُو نے سب توقیرِ دل

منہ میں گھی شکر:

لے کے دل چرب زبانی سے، یہ میٹھے اِنکار

دیں گے اِن باتوں سے مُنہ میں تیرے گھی شکر لوگ

نقشِ کالحجر:

ناصح! تجھے ہے وہم، مِٹا لوحِ دل سے کب؟
ہے نقشِ کالحجر بُتِ بدذات کا خیال

نیلا پیلا ہونا:

جو رنگِ زرد پہ میرے یہ نیلے پیلے ہو
کہاں کے ایسے ہو تم شاخِ زعفراں آئے؟

ہاتھ اُٹھانا:

نوازش! ہاتھ رونے سے اُٹھاؤں کب میں گردن گش
دِٹھا دے تا نہ مجھ کو چشمِ دریا بار گردن تک

ہاتھوں ہاتھ:

حاجت اُس بُت سے لگی ملنے ز بس ہاتھوں ہاتھ
پھر گیا اپنا خُدا کی بھی مُناجات سے دل

ہم پیالہ ہونا:

ہم پیالہ وہ ہیں، اُس نے مُنہ لگایا ہے جنھیں
دُور ہیں ہم، خشک لب ہیں، اُس کے پیمانوں کے رنگ

یک مشت ادا کرنا:

نقدِ داغ آج میں یک مشت ادا کرتا ہوں
بسکہ اے یار! ہے سودا تیری دکاں سے اُٹھا

۱۵۔متروکات:

ہر زندہ زبان ارتقاء کے مراحل طے کرتے وقت بہت سے نئے الفاظ اپنا لیتی ہے اور بہت سے پرانے الفاظ کو چھوڑ دیتی ہے۔ اِن الفاظ کو متروکات کہتے ہیں۔ اردو زبان نے بھی اپنے آغاز سے لے کر اب تک بہت سے الفاظ اپنائے ہیں اور بہت سے الفاظ ترک کر دیے ہیں۔ نوازِش کے کلام میں بھی درجنوں ایسے الفاظ موجود ہیں، جو اُس وقت رائج تھے،

مگر آج متروک ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے کچھ الفاظ کی فہرست کچھ یوں ہے:

آپ روپ۔ (بذاتِ خود):

کی سب سے ترک سلامُ علیک جن کے لیے
لو! آپ روپ بھی لیتے میرا سلام نہیں

آرے بلے کرنا۔ (ٹال مٹول کرنا):

سوالِ بوسہ پر آرے بلے ہر روز کرتا ہے
نہیں پڑتا ہے مُنہ، کِس مُنہ سے کوسوں اُس کی ہُوں ہاں کو

اصلا۔ (بالکل):

نہ یہ طرزِ کلام اصلا کسی میں ہے، نہ یہ ہنسنا
لٹکتا ہے تلے کانوں کے جس صاحب کا ہر پٹا

بت باہری پن۔ (ہمت یا طاقت سے سے زیادہ کرنا، اوقات سے بڑھ جانا):

دِلا! میں اِس ترے بت باہری پن کا بھی کشتہ ہوں
کہ اِس سُوکھے بدن پر دیوِ غم کو کیا پچھاڑا ہے

بل بے۔ (واہ، بہت خوب، کیا کہنے):

بل بے نوازشِ حزیں! شعر تھے یا تھا مرثیہ؟
بزم کی بزم کا جگر، تُو نے تو سب ہلا دیا

بلّلا۔ (احمق، بے وقوف، بے سلیقہ، چھچھورا):

کہوں آہستہ سے جو میں، جواب اُس کا دو چپکے سے
بڑے تم ہو بلّلے، کیا ہے موقع غُل مچانے کا؟

بہبہا۔ (بگڑا ہوا، ہاتھ سے نکلا ہوا):

طفلِ اشک آنکھوں میں ٹھہرا ہے تو چشمک زن نہ ہو
پھر نہ سنبھلے گا جو لڑکا بہبہا ہو جائے گا

تراہ تراہ۔ (ہر شخص کی زبان پر آہ و فغاں ہونا):

پڑی ہے تیغِ نِگہ سے تری تراہ تراہ

رکھے حق اِس تری تیغِ تراہ سے محفوظ

تھانگی دار۔(چوروں کو پناہ دینے والا، رسہ گیر):

زُلف کی سانی چڑھا، سانی ہے یہ تھانگی دار
دل چُرا اُس نے رکھا طُرۂ طرّار کے پاس

چکھی۔(چاٹ، چسکا):

اُس لب میں نہیں ہے کچھ مٹھائی رکھی
سمجھا ہے غلط دِلا! تُو اُس کو چکھی

چھاتی کے کواڑ۔(سینہ کے دونوں پہلو، سینہ کی دونوں اطراف)

نہ کرو بند، جو کھولو مری چھاتی کے کِواڑ
مُوند لو رخنے، کبھی اپنے جو در میں دیکھو

چُھٹ پیل۔(نڈر ہاتھی، مراد ہے دلیر آدمی):

کھا کے تلوار لپٹ جائیں، وہ چُھٹ پیل ہیں ہم
ہاں ملاقات یونھیں سینہ سپر کرتے ہیں

چھدرے چھدرے۔(الگ الگ، چھیددار، فرق فرق سے):

میں پسا جاتا ہوں یونہی، کس لیے تنتے ہیں اب؟
چھدرے چھدرے، واچھڑے! کیا ذکر ہے اِس گات کا

ڈہ ڈہائیں۔(سرسبز، تروتازہ، خوش وخرم):

وِصالِ یار، شادیِ مرگ از بس ہو گیا مجھ کو
تُو کیسا ڈہ ڈہائیں ہے مرے گلہائے مدفن پر

زندہ پہلوان۔(نہایت قوی شخص، جس کا کوئی مدِ مقابل نہ ہو):

ہمیں کب تک دبیں، پھرتے ہو زندہ پہلوان تم تو
بجا کہتا ہوں، بجتی ہی نہیں اک ہات تالی ہے

سفلے کا روزگار۔(کمینے کی نوکری، کم ظرف کی ملازمت):

اک بوسہ بے طلب دے، رکھا مُنہ پہ لاکھ بار

سفلے کا روزگار کِیا، ہم نے کیا کِیا؟

سگھڑ بھلائی۔(خوشامد، چاپلوسی):

وقتِ نزع کیا تھا کام یاں بھلا دوائی کا
تم میں کیا برا لپکا ہے سگھڑ بھلائی کا

شیر لاگو ہونا۔(کسی جگہ شیر کا حملہ معمول بن جانا):

کِشورِ دل میں نوازِش! گذر اُس کا ہے یُوہیں
شیر جس طرح کسی قریہ میں لاگو ہو جائے

مت بھنگ۔(کم عقل، احمق، ہوش وحواس سے عاری):

باوجود ایں ہمہ اپنی یہ ہوئی کچھ مت بھنگ
محفلِ عیش میں تھا بسکہ میں تجھ بن دل تنگ

مُنڈ چڑا پن۔(ضد، ہٹ، اڑیل پن):

مِیاں! دلِ شیریں تو کیا تھا؟ آب ہوتا سنگ بھی
اور اگر فرہاد کچھ دن مُنڈ چڑاپن چھوڑ دے

نُت بڑھاؤ۔(طول کلام، مبالغہ آمیز طویل گفتگو، حد سے زیادہ تعریف):

اُسی کی زُلف کا ہے بات بات میں بِستار
دِلا! مجھے ترا بھاتا یہ نُت بڑھاؤ نہیں

نیل کا ماٹ بگڑنا۔(چلن بگڑنا، نظام ابتر ہونا، بھاری نقصان ہونا، بربادی ہونا):

کاش اِس نیل کا ماٹ اب تو نوازِش! بگڑے
کہ ہے مُدّت سے خُمِ گُنبدِ دوّار کبود

حوالے:

۱۔ دِلّی کا دبستانِ شاعری :ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی: اردو اکیڈمی، کراچی: ۱۹۶۲ء: ص ۱۱۔

۲۔ تاریخ ادب اردو :رام بابو سکسینہ/مرزا محمد عسکری(مترجم): سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۱ء: ص ۴۲۔

۳۔ اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر :ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد: مجلس ترقیِ ادب، لاہور: ۲۰۰۸ء: ص ۹۵۔

۴۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری :ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی :۲۰۰۲ء :ص ۵۲۱۔

۵۔ کاشف الحقائق :امداد امام اثر :قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی :۱۹۸۲ء :ص ۱۲۱۔

۶۔ مقدمۂ شعر و شاعری :الطاف حسین حالی :خزینۂ علم و ادب، لاہور :ص ۹۱۔

۷۔ ہندوستانی لسانیات :ڈاکٹر محی الدین قادری زور :نسیم بکڈپو، لکھنؤ :۱۹۶۰ء :ص ۳۱۔

۸۔ تاریخ ادبِ اردو :ص ۱۴۶۔

۹۔ گذشتہ لکھنؤ۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ :عبدالحلیم شرر :پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور :۲۰۰۰ء :ص ۱۲۱۔

۱۰۔ تاریخ ادبِ اردو :ص ۲۱۳۔

۱۱۔ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر :ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار :سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور :۱۹۹۸ء :ص ۲۶۶۔

۱۲۔ محولہ بالا :ص ۲۷۴۔

۱۳۔ محولہ بالا :ص ۲۷۲۔

۱۴۔ مجموعۂ تنقیدات :آلِ احمد سرور :الاعجاز پبلی کیشنز، لاہور :ص ۱۵۶۔

۱۵۔ اردو ادب کی فنی تاریخ :ڈاکٹر فرمان فتح پوری :الوقار پبلی کیشنز، لاہور :۲۰۰۳ء :ص ۲۶۴۔

۱۶۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ :ڈاکٹر سلیم اختر :سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور :۲۰۰۹ء :ص ۲۲۳۔

۱۷۔ تاریخ ادبِ اردو :ص ۱۵۵۔

۱۸۔ مصحفی۔ حیات اور شاعری :نور الحسن جعفری :مجلس ترقیِ ادب، لاہور :۱۹۹۸ء :ص ۹۶۔

۱۹۔ تحقیق و تنقید :ڈاکٹر فرمان فتح پوری :الوقار پبلی کیشنز، لاہور :۲۰۱۳ء :ص ۲۳۴۔

۲۰۔ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر :ص ۲۷۶۔

۲۱۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری :ص ۱۶۱۔

۲۲۔ محولہ بالا :ص ۱۶۱۔

۲۳۔ محولہ بالا :ص ۱۴۲۔

۲۴۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر :ڈاکٹر ابوالخیر کشفی :نشریات، لاہور :۲۰۰۷ء :ص ۱۷۵۔

۲۵۔ تاریخ ادبِ اردو :ص ۱۴۵۔

۲۶۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر :ص ۱۸۵۔

۲۷۔ گذشتہ لکھنؤ۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ :ص ۸۸۔

۲۸۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر :ص ۱۷۴۔

۲۹۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری :ص ۱۴۲۔

۳۰۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا : سعادت خان ناصر رمشفق خواجہ (مرتب): مجلس ترقیِ ادب، لاہور: ۱۹۷۰ء: ص۲۲۴۔

۳۱۔ تذکرۃ الشعراء : حسرت موہانی رشفقت رضوی (مرتب): ادارہ یادگارِ غالب، کراچی: ۱۹۹۹ء: ص۴۳۱و۴۳۲۔

۳۲۔ عیارالشعراء : خوب چند ذکاء: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی: ۲۰۱۱ء: ص۱۵۵۔

۳۳۔ تاریخِ ادبِ اردو ، جلد سوم: ڈاکٹر جمیل جالبی: مجلس ترقیِ ادب، لاہور: جون ۲۰۰۶ء: ص۷۰۲و۷۰۸۔

۳۴۔ ریاض الفصحاء : غلام ہمدانی مصحفی: برقی پریس، دہلی: ۱۹۳۵ء: ص۳۳۹۔

۳۵۔ اردو کے قدیم پشتون شعراء : محمد افضل رضا: پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی، پشاور: ۱۹۹۸ء: ص۳۰۱۔

۳۶۔ سید محمد میر سوز : ڈاکٹر سردار احمد خان: علمی ورثہ، کراچی: ۲۰۰۳ء: ص۱۷۷۔

۳۷۔ دیوانِ نوازش از قاضی عبدالودود مشمولہ آج کل ، نئی دہلی: جولائی ۱۹۶۲ء: ص۴۔

۳۸۔ پیمانۂ غزل ، جلد اول: محمد شمس الحق: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد: ۲۰۰۸ء: ص۱۲۹۔

۳۹۔ ریاض الفصحاء : ص۳۳۹۔

۴۰۔ پیمانۂ غزل : ص۱۲۹۔

۴۱۔ مجمع الانتخاب (قلمی): شاہ کمال: مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی: ص۷۰۶۔

۴۲۔ آبِ حیات : محمد حسین آزاد: خزینۂ علم و ادب، لاہور: ۲۰۰۱ء: ص۱۸۶۔

۴۳۔ ریاض الفصحاء : ص۳۳۹۔

۴۴۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار : مرزا جعفر حسین: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی: ۱۹۹۸ء: ص۳۴و۳۵۔

۴۵۔ تاریخِ ادبِ اردو ، جلد چہارم: ڈاکٹر جمیل جالبی: مجلس ترقیِ ادب، لاہور: فروری ۲۰۱۲ء: ص۲۷۔

۴۶۔ محولہ بالا: ص۵۸۲۔

۴۷۔ تحقیق کی روشنی میں : ڈاکٹر عندلیب شادانی: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: ۱۹۶۳ء: ص۲۰۹۔

۴۸۔ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے : ڈاکٹر نیر مسعود رضوی: الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد: س ن: ص۸۶و۸۷۔

۴۹۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا : ص۲۲۴۔

۵۰۔ رشید حسن خاں: ص۴۰۔

۵۱۔ محولہ بالا: ص۴۱۔

۵۲۔ محولہ بالا: ص۲۵و۲۶۔

۵۳۔ محولہ بالا: ص۴۴و۴۵۔

۵۴۔ محولہ بالا: ص۴۱۔

۵۵۔ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے : ص۸۹۔

۵۶۔ دیوانِ نوازش از قاضی عبدالودود مشمولہ آج کل ،نئی دہلی:ص۴۔

۵۷۔ رجب علی بیگ سرور۔حیات اور کارنامے :ص۱۰۱۔

۵۸۔ تاریخ ادبِ اردو ،جلد سوم:ص۸۲۴۔

۵۹۔محولہ بالا:ص۸۲۴۔

۶۰۔ تاریخ ادبِ اردو ،جلد سوم:ص۶۴۰۔

۶۱۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا :ص۱۹۳۔

۶۲۔ تاریخ ادبِ اردو ،جلد سوم:ص۶۴۰۔

۶۳۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا :ص۱۹۴۔

۶۴۔ تذکرۃ الشعراء:ص۴۳۲۔

۶۵۔ تاریخ ادبِ اردو ،جلد سوم:ص۵۸۲۔

۶۶۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا :ص۱۹۴۔

۶۷۔ایضاً۔

۶۸۔ایضاً۔

۶۹۔ تاریخ ادبِ اردو ،جلد سوم:ص۲۷۔

۷۰۔ ریاض الفصحاء:ص۳۴۲۔

۷۱۔ایضاً۔

۷۲۔محولہ بالا:ص۹۹۔

۷۳۔ایضاً۔

۷۴۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا :ص۱۹۵۔

۷۵۔ایضاً۔

۷۶۔ سراپا سخن :سید محسن علی محسن:منشی نولکشور،لکھنؤ:طبعِ ثانی ۱۸۷۵ء:ص۲۷۰۔

۷۷۔ایضاً۔

۷۸۔محولہ بالا:ص۲۵۵۔

۷۹۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا :ص۱۹۵۔

۸۰۔ ریاض الفصحاء:ص۲۰۔

۸۱۔ایضاً۔

۸۲۔ ایضاً۔

۸۳۔ ایضاً۔

۸۴۔ میر قطب الدین باطن: ص۱۲۲۔

۸۵۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ: ص۳۲۳۔

۸۶۔ گلشنِ ہمیشہ بہار: نصر اللہ خویشگی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی: ۱۹۶۷ء: ص۱۹۳۔

۸۷۔ ایضاً۔

۸۸۔ تذکرہ معرکۂ خوش زیبا: ص۱۹۵۔

۸۹۔ سراپا سخن: ص۲۵۲۔

۹۰۔ ریاض الفصحاء: ص۹۲۔

۹۱۔ سراپا سخن: ص۲۵۲۔

۹۲۔ محولہ بالا: ص۱۹۵۔

۹۳۔ ریاض الفصحاء: ص۳۵۳۔

۹۴۔ اردو غزل: ڈاکٹر یوسف حسین خان: القمر انٹر پرائزز، لاہور: س ن: ص۷۰۔

۹۵۔ محولہ بالا: ص۱۱۰۔

۹۶۔ سید میر محمد سوز: ص۱۷۹۔

۹۷۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ص۱۴۷۔

۹۸۔ اردو غزل: ص۲۲۴۔

۹۹۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ص۱۴۸۔

۱۰۰۔ ایضاً۔

۱۰۱۔ محولہ بالا: ص۵۸۲۔

۱۰۲۔ اردو غزل: ص۷۰۔

۱۰۳۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ص۲۲۔

۱۰۴۔ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر: ص۲۷۵۔

استدراک:

فاضل مقالہ نگار نے بہت محنت اور لگن سے مقالہ لکھا، مگر کہیں کہیں متضاد آراء بھی اس میں داخل ہو گئیں اور ان کی

نظران تضادات کی طرف نہیں گئی، مثلاً: وہ لکھتے ہیں: ''ایک جگہ نواز‌ش نے سودا کو ولی کہہ کر پکارا ہے اور میر سے چھیڑ خانی کی ہے:

ایسے ولیوں سے نوازش! نہ الجھ، سودا ہے
چھیڑنا ہے تجھے منظور ہی تو میر کو چھیڑ''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: ''اسی طرح اس شعر میں بھی میر تقی میر کا ذکر ملتا ہے، جو اُن دنوں لکھنؤ میں موجود تھے اور غالباً نوازش سے بہت اچھے تعلقات بھی رکھتے تھے۔ میر تقی میر، نوازش کے ہم عصر تھے اور ان کا انتقال بھی ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا۔''
اگر نوازش سودا کو ولی جانتے تھے اور میر سے چھیڑ چھاڑ کو روا رکھتے تھے تو پھر میر سے ان کے تعلقات بہت اچھے ہونا کچھ مشکوک سا معلوم ہوتا ہے۔ میر نے جس طرح کا مزاج پایا تھا اور جس قدر وہ نازک مزاج اور زود رنج تھے، اس حوالے سے دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والے سے کیونکر اچھے تعلقات استوار رکھ سکتے تھے؟

دوسری بات یہ کہ دیوانِ نوازش کا منحصر بہ فرد نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ کا مخزونہ ہے۔ اسی ادارے نے اس مخطوطے کا عکسی ایڈیشن قاضی عبدالودود کی تقدیم کے ساتھ چھاپا ہے۔ یقیناً یہی ایڈیشن مقالہ نگار کے پیشِ نظر رہا ہے، مگر انھوں نے دیوان کا جو تعارف لکھا ہے، اس سے اشتباہ ہوتا ہے، گویا وہ اصل مخطوطے سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے پورے مقالے میں کہیں بھی نہ مخطوطے کا حوالہ دیا ہے اور نہ ہی مطبوعہ عکسی اشاعت کا۔

تیسری بات یہ کہ نوازش نے جرأت کے انتقال پر جو قطعۂ تاریخ کہا، مقالہ نگار نے اس کے چوتھے مصرع (آج جرأت کا انتقال ہوا) کو نشان زد کر کے ۱۲۲۴ھ لکھ دیا۔ ان کی توجہ اس جانب مبذول نہیں ہوئی کہ اس مصرع سے ۱۲۲۳ کے اعداد متخرج ہوتے ہیں۔ شاعر نے تیسرے مصرع میں نہایت قرینے سے ایک الف کا ایزاد کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

کہا ہاتف نے رو کے از سرِ آہ!

آہ کا سر، یعنی الف کا ایک عدد چوتھے مصرع کے اعداد میں شامل کرنے سے جرأت کا سنۂ وصال برآمد ہوتا ہے۔ آخری مصرع کو نشان زد کرنے کے ساتھ ساتھ تیسرے مصرع کے لفظ آہ کا الف بھی خط کشیدہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح نوازش لکھنوی نے اپنے شاگرِ عزیز رجب علی بیگ سرور کی کتاب فسانۂ عجائب کی تاریخِ تکمیل (۱۲۴۰ھ) بھی رقم فرمائی۔ مقالہ نگار نے چوتھے مصرع (فلک ایس گلستانِ بے خزاں داد) کو نشان زد کر کے سنہ لکھ دیا۔ یہاں بھی ان سے غلطی سرزد ہوئی، کیونکہ پورے مصرع سے نہیں، بلکہ گلستانِ بے خزاں داد سے سنۂ تکمیل کا استخراج ہوتا ہے۔ (مدیر)

حمیداللہ خٹک
ایم فل اسکالر، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کچھ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بارے میں

Hameedullah Khattak
Mphil Scholar, Department of Urdu, AIOU, Islamabad

Abstract: Moulana Imtiaz Ali Khan is one of the greatest scholars and researcher of Urdu and other oriental languages. Many researchers have conducted very useful and informative researches regarding life and work of Moulana.But many dimensions of his personal life are yet to be explored. The present study reveals many important aspects related to the Moulana's life and family background. The researcher has the provilege of conducting interview with the son of Moulana- Dr. Najaf Ali Khan.This interview has yielded many important information about Moulana's life. This research is based on the interview with Dr. Najaf Ali Khan.

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (۲۹ر رمضان ۱۳۲۲ھ/۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء) بیسویں صدی کے نامور محقق اور مدون تھے۔ انھوں نے تحقیق اور تدوین کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا، مگر کسی شعری محفل میں انھوں نے کبھی شرکت نہیں کی۔ البتہ ان کا کلام کئی رسالوں میں چھپتا رہا۔ ان کا خاصا غیر مطبوعہ کلام بھی بیاض کی صورت میں ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔ بعد ازاں وہ تحقیق اور تدوین کی سنگلاخ وادیوں میں سرگرداں ہو گئے، مگر وہ شعر گوئی سے منحرف نہیں ہوئے۔ ابتداً تاج تخلص کرتے تھے، لیکن بعد ازاں عرشی تخلص کرنے لگے۔

راقم ان کی کتاب اردو اور افغان (۱) کی ترتیب و تہذیب اور اس پر حواشی و تعلیقات کے دوران میں ان کے احوال و آثار کی تلاش و جستجو میں منہمک رہا۔ کئی نوادر نظر نواز ہوئے۔ ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی بیسیوں تصاویر بھی جمع ہو گئیں۔ ان کے کلام کے کئی نمونے بھی اکٹھے کیے۔ لطف کی بات یہ کہ ان کا شادی کارڈ بھی ڈھونڈ نکالا۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر نجف علی خاں سے ایک تحریری مکالمہ بھی ہوا۔ اس میں مولانا کی زندگی، ان کی اولاد و امجاد اور عزیز و اقارب کے بارے میں بعض نادر اور کمیاب معلومات یکجا ہو گئیں۔ اس میں مولانا اور ان کی اولاد کے حوالے سے کئی باتیں ایسی ہیں، جو پہلی بار سامنے آ رہی ہیں۔ مولانا عرشی کی شادی کا کارڈ ملاحظہ فرمائیے اور ازاں بعد ان کے صاحبزادے سے کیا گیا تحریری مکالمہ۔

[ا]

شادی کارڈ

ہر بنِ مو سے شکر جاری ہے
فاضل و مولوی کی شادی کا
عرشیوں میں بھی غل ہے اے مضموں
امتیازِ علی کی شادی کا

جنابِ معظم!

بتقریبِ سعید شادی خانہ آبادی نورِ نظر امتیاز علی خاں عرشی بتاریخ ۵ر ماہ شعبان ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۴ر ماہ نومبر ۱۹۳۳ء روز جمعہ وقت صبح بخانۂ غریب تشریف ارزانی فرما کر طعامِ ماحضر تناول فرما کر بندہ کو ممنونیت کا موقع دیا جائے۔

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

المکلف

محمد مختار علی خان منصرم اصطبل محلہ باغ بختہ

خورشید عالم پریس، ریاست رامپور

[۳]

ڈاکٹر نجف اشرفی کو بھیجا گیا سوالنامہ:

سوال ۱: ذکرِ عرشی (از مالک رام) کے مطابق مولانا امتیاز علی عرشی کا شجرۂ نسب یوں ہے: امتیاز علی خاں ابن ڈاکٹر مختار علی خاں ابنِ مولانا اکبر علی خاں ابنِ رحم باز خاں، لیکن ان کے بعد لکھے گئے اسمائے شجرہ تحقیق کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے، کیونکہ مشرف خان اور مقرب خان دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی مشرف خان افغانستان میں اقامت پذیر تھا، جبکہ چھوٹا بھائی مقرب خان ناراض ہو کر ہندوستان آ گیا تھا۔ مشرف خان کا پوتا رحم باز خان اور مقرب خان اور مقرب خان کا پوتا محمد سعید خان ہے۔ محمد سعید خان کی بیٹی سے رحم باز خان کی شادی منطقی لحاظ سے (عمروں کے لحاظ سے) مشکوک ہے۔ وضاحت چاہیے؟

سوال ۲: مولانا امتیاز علی عرشی کی والدہ کا نام کیا تھا؟

سوال ۳: مولانا امتیاز علی عرشی کی سوتیلی ماں کا نام کیا تھا اور وہ کب فوت ہوئیں؟

سوال ۴: مولانا امتیاز علی عرشی نے شادی کب کی اور بیوی کا نام کیا تھا؟

سوال ۵: مولانا امتیاز علی عرشی کی اولاد و امجاد کے بارے میں مکمل تفصیل فراہم کریں؟

سوال ۶: مولانا امتیاز علی عرشی کے ایک سوتیلے بھائی پاکستان آ گئے تھے۔ وہ پاکستان کے کس شہر میں رہتے ہیں؟

سوال ۷: مولانا امتیاز علی عرشی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب و مقالا جات / مضامین کی مکمل فہرست اس انداز میں ارسال فرمائیں:

نمبر شمار	نام کتب	اشاعتی ادارہ	سنۂ اشاعت

سوال ۸: اردو اور افغان یہ مقالہ پہلی بار ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ میں پڑھا گیا۔ اس تحقیقی مقالے پر مولانا امتیاز علی عرشی نے کب کام کا آغاز کیا تھا؟ کوئی خط یا تحریر بطور حوالہ اگر مل سکے۔

سوال ۹: اردو اور افغان کا مسودہ پشتو اکیڈمی پشاور میں نہیں ہے۔ اس کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔

سوال ۱۰: یہ مقالہ پہلی بار پاکستان میں اورینٹل کالج میگزین لاہور سے مئی ۱۹۴۸ء میں، جبکہ ہندوستان میں معارف اعظم گڑھ سے مارچ، اپریل اور مئی ۱۹۴۹ء میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو کہیں شائع نہیں ہوا؟

سوال ۱۱: یہ مقالہ ۱۹۶۰ء میں جب اردو اور افغان کے نام سے پشتو اکیڈمی پشاور سے شائع ہوا تو کیا مولانا امتیاز علی عرشی کی نظر سے گزرا تھا، یا نہیں؟

سوال ۱۲: مولانا عبدالقادر مرحوم (سابق ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور) سے مولانا امتیاز علی عرشی کی جو مکاتیب رہی، مولانا عرشی کے مکاتیب کے ذخیرے میں اردو اور افغان سے متعلق کوئی حوالہ مل سکتا ہے؟ خط کی عکسی نقل اگر آپ سکین کر کے E.Mail کر سکیں۔

سوال ۱۳: مولانا امتیاز علی عرشی کے خاندان میں اب بھی کوئی پشتو زبان جانتا ہے؟

سوال ۱۴: کیا مولانا امتیاز علی عرشی کو پشتو زبان میں یہ تینوں بنیادی مہارتیں یعنی (بولنا، لکھنا، پڑھنا) حاصل تھیں؟

سوال ۱۵: مولانا امتیاز علی عرشی کی کوئی بھی پشتو نثری، یا منظوم تحریر اگر مل سکے۔

سوال ۱۶: مولانا امتیاز علی عرشی نے پشتو میں کبھی شاعری کی؟ نمونے کے طور پر اگر چند شعر مل جائیں۔

سوال ۱۷: ڈاکٹر زہرہ عرشی نے میرے ابا اور میں میں لکھا ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو ابا میرے سلانے کے لیے اپنی شریں آواز میں ایک پشتو لوری گنگناتے تھے۔ اگر وہ پشتو لوری لکھ کر بھیج دیں۔

سوال ۱۸: مولانا امتیاز علی عرشی کی تصاویر بھی درکار ہیں۔ اگر وہ بھی E.Mail کر سکیں۔

سوال ۱۹: مولانا امتیاز علی عرشی کے مقبرے کی تصویر چاہیے۔

سوال۲۰: مولانا امتیاز علی عرشی بطور ماہرِ غالبیات کے موضوع پر عبدالحمید نے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی زیرِ نگرانی علی گڑھ یونیورسٹی میں کام کیا ہے۔ اس مقالے کا پہلا باب، مولانا امتیاز علی عرشی کے سوانح کے بارے میں ہے۔ یہ اگر مل سکے تو مہربانی ہوگی۔

[۴]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم جناب حمیداللہ

سلامِ مسنون۔ والد مرحوم کے خاندانی شجرے، علمی کارناموں و اقرباء و اعزاء، نیز اولادوں سے متعلق آپ کی استفساری تحریر، یا سوالنامہ موصول ہوئے تقریباً چھے ماہ، یا کچھ زائد عرصہ گزر گیا اور جواب نہیں گیا، اس غیر معمولی تاخیر کے لیے میں بہت شرمندہ بھی ہوں اور معافی کا خواستگار بھی۔

دراصل باعثِ تاخیر ہمشیرہ ڈاکٹر زہرہ عرشی مرحومہ کی علالت اور تیمارداری میں مشغولیت تھی۔ وہ طویل عرصے سے صاحبِ فراش تھیں۔ ذیابیطس Diabeties کے مرض نے گردوں کو ناکارہ کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ضعف میں اضافہ ہوتا گیا اور آخر کار ۱/۷ اگست ۲۰۱۵ء کی شب انتقال کر گئیں، اناللہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

ذیل میں آپ کے سوالوں کا جواب نمبروار پیشِ خدمت ہے:

۱۔ شجرۂ نسب میں اسی طرح درج ہے، جو بزرگوں کے بیان کے مطابق ہے، وہ یہ کہ: رحم باز خاں اور گل باز خان دو بھائیوں کو سوات (صوبہ سرحد) سے بلا کر رسالدار محمد سعید خاں اور رسالدار محمد سخی خاں ولد مقرب خاں نے اپنی دو بیٹیوں کا عقد، ان دونو وارد بھائیوں کے ساتھ کیا تھا، جو شرف خاں مقیم سوات کے پوتے تھے۔ شجرے میں غلطی کا امکان بہت کم ہے، کیونکہ مولانا عرشی کے والد ڈاکٹر مختار علی خاں اور دادا مولوی اکبر علی خاں کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ علاوہ ازیں مالک رام صاحب نے، جو کچھ اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے، وہ والد مرحوم مولانا عرشی سے لیے گئے ایک انٹرویو (مکالمے) پر مبنی ہے۔

۲۔ مولانا عرشی کی والدہ کا نام شمیم بیگم (عرف چھمی بیگم) بنتِ غلام قادر خاں آخندزادہ تھا۔ موصوف محکمۂ عالیہ ریاست رامپور میں اہلمد کے عہدے پر فائز تھے اور ان کے ماموں احمد خاں ولد غلام قادر خاں تھے، جو پیشے سے وکیل تھے۔ (احمد جان خاں، وکیل مولانا عرشی کے ماموں تھے)

۳۔ مولانا عرشی کی سوتیلی ماں فاطمہ بیگم بنتِ تفضّل حسین خاں (کوتوال ریاست رامپور) تھیں۔ انھوں نے اوائلِ دسمبر ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔

۴۔ مولانا عرشی کی شریکِ حیات کا نام حاجرہ بیگم بنتِ اشفاق النبی خاں (کوتوال ریاست رامپور)۔ ان کی شادی

۱۹۳۳ء میں ہوئی تھی۔موصوفہ کی وفات ۳۰ مئی ۱۹۹۷ء کو ہوئی۔

۵۔مولانا عرشی کے سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) اکبر علی خاں عرشی زادہ (ایم اے فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ڈائریکٹر رضا لائبریری رامپور (تاریخ وفات ۶ر اکتوبر ۱۹۹۷ء) معروف ادیب اور شاعر تھے۔دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ کی تحقیق واشاعت کی۔موصوف کا شمار برصغیر کے نامور ادیبوں میں ہوتا تھا۔اقبالیات وغالبیات پر گہری نظر تھی۔متعدد رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ان کا منتخب کلام بعنوان سخن میرے تمھارے درمیاں منظر عام پر آچکا ہے۔

(ب) صالحۃ الکبریٰ (ادیب ماہر، ادیب کامل وغیرہ) گھر پر اپنے والد سے حصولِ تعلیم کی۔جامعۂ اردو، علی گڑھ سے فارسی اور اردو میں سندیں حاصل کیں۔ان کی شادی ذکی اللہ خاں (انجینئر) ولد فرید اللہ خاں پر پوتے رسالدار محمد سعید خاں سے ہوئی۔صاحبِ اولاد ہیں۔(تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔) تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار ہیں۔

(ت) مختار عرشی (ادیب ماہر وغیرہ، جامعۂ اردو علی گڑھ) لاولد

(ث) ڈاکٹر زہرہ عرشی (ایم اے فارسی، پی ایچ۔ڈی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) علی گڑھ یونیورسٹی میں درس وتدریس سے وابستہ رہیں۔دو سال قبل ۲۰۱۳ء میں ریڈر کے عہدے، یا پوسٹ سے ریٹائر ہوئیں۔فرہنگِ جہانگیری کی تحقیق وتدوین ان کا اہم علمی کارنامہ ہے۔ان کی شادی سید راشد حسین صاحب (مرحوم) ریڈر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہوئی تھی۔۱۷راگست ۲۰۱۵ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔لاولد تھیں۔اللہ تعالیٰ جنت الفردوس سے نوازے۔(آمین)

(ج) ڈاکٹر ممتاز عرشی (ایم ایس سی علم نباتات، پی ایچ۔ڈی، علی گڑھ) یو پی کے مختلف اضلاع کے کالجوں میں لیکچرار رہے۔بعد ازاں ترقی پا کر ریجنل ہائر ایجوکیشنل آفیسر میرٹھ زون مقرر ہوئے اور پھر پرنسپل گجرولہ ڈگری کالج بنائے گئے۔چند سال قبل وہیں سے ریٹائر ہوئے۔صاحبِ اولاد ہیں۔ایک لڑکا حماد عرشی ڈاکٹر اور دوسرا طلحہ انجینئر ہے۔

(چ) ڈاکٹر نجف عرشی (ایم اے عربی علی گڑھ، پی ایچ۔ڈی، جامعہ زیتونہ، تیونس یونیورسٹی) خلیج عربی (قطر) وزارتِ داخلہ میں بحیثیت افسر شعبۂ اخبارات وجرائد سے منسلک رہے۔ان کی تحقیق کردہ کتاب وجوہ القران لاسماعیل الحیری کو آستانۂ قدس مشہد ایران نے شائع کیا ہے۔صاحبِ اولاد ہیں۔ایک لڑکا زیر عرشی زیرِ تعلیم ہمدرد میڈیکل کالج، دہلی (سال سوم) اور ایک لڑکی شیما عرشی (ایم کام، بی ایڈ) ہے۔

(ح) جعفر عرشی (بی فارما، جامعہ ہمدرد دہلی و فارمیسی کالج باسٹن یونیورسٹی) خلیج غربی اور امریکہ کی متعدد دوا کمپنیوں سے وابستہ رہے۔ ذاتی فارمیسی بھی قائم کی۔ صاحبِ اولاد ہیں۔ بیٹے کا نام دادا کے نام پر رکھا، یعنی امتیاز عرشی اور بیٹی نبیلہ عرشی ہے۔ دونوں تعلیم یافتہ اور امریکہ میں برسرِ روزگار ہیں۔

(خ) راشد عرشی (بی اے) متعدد کمپنیوں میں SalesManager رہے۔ صاحبِ اولاد ہیں۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی شادی شدہ۔ باقی بچے زیرِ تعلیم ہیں۔

(د) طاہر عرشی (بی کام علی گڑھ، ایم بی اے لندن) دنیا کے مختلف خطوں میں علیحدہ علیحدہ کمپنیوں میں خدمات انجام دیں۔ کویت، مالدیوز وغیرہ ملازمت کے سلسلے میں رہے۔ آج کل علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ ایک لڑکی اللہ نے عطا کی ہے۔

(۶) ان کے سوتیلے بھائی امانت علی خاں سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور ہری پور ہزارہ ضلع راولپنڈی [کذا] میں سکونت پذیر تھے۔ موصوف کا انتقال عارضۂ قلب کے سبب ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا شجاعت علی خاں اور دو لڑکیاں تھیں۔ دوسری بیوی، جو ہری پور کی مقامی خاتون تھیں، ان سے مزید تین اولادیں تھیں۔ پہلی بیوی کی تین اولادوں میں صرف ایک لڑکا شجاعت علی خاں بقیدِ حیات ہے، جبکہ اس کی دو حقیقی بہنیں فوت ہو چکی ہیں۔ دوسری بیوی کی اولادوں کا ہم سے رابطہ نہیں ہے، اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔

۷۔ مولانا عرشی کی بعض مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب کی فہرست پیشِ خدمت ہے۔ البتہ مضامین و مقالات کی فہرست تیار نہیں ہے۔

۸۔ مجھے اس کے بارے میں علم نہیں۔ کوشش کی، لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔

۹۔ اردو اور افغان کا مسودہ پشتو اکیڈمی پشاور میں ہی ہونا چاہیے۔

۱۰۔ ۱۹۴۸ء میں اورینٹل کالج میگزین میں چھپنے سے پہلے اس کا ایک حصہ ماہنامہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۴۷ء ماہ جولائی کے شمارے میں بعنوان اردو زبان اور اس کی تذکیر و تانیث پر پشتو کا اثر شائع ہوا تھا، وہ اب اردو اور افغان میں شامل ہے۔

۱۱۔ جی ہاں! یہ کتاب ان کی نظر سے گزری تھی۔ اس کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں محفوظ ہے۔

۱۲۔ مولانا عبدالقادر مرحوم اور مولانا عرشی کے درمیان جو خط و کتابت [کذا] اس کتاب کے شائع کرنے کے سلسلے میں ہوئی تھی، اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔

۱۳۔افسوس کہ کوئی بھی پشتو سے واقفیت نہیں رکھتا۔

۱۴۔مولانا عرشی پشتو بولنا، لکھنا اور پڑھنا سب جانتے تھے، لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کو زبان پر کتنی مہارت، یا عبور حاصل تھا؟

۱۵۔میری نظر سے ان کی کوئی پشتو تحریر نہیں گزری۔

۱۶۔اس کے بارے میں مجھے علم نہیں۔پشتو زبان کا کوئی شعر کہتے نہیں سنا۔

۱۷۔جس لوری کا مرحومہ زہرہ عرشی نے ذکر کیا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں: استاعمر ڈیروے فرخنده ماببولا ماالله تاببولا ما مولاتاببولا ما۔انھیں الفاظ کو بار بار دہرایا کرتے تھے۔

۱۸۔تصاویر ارسالِ خدمت ہیں۔ان کی تعداد ۱۶ ہے۔تصاویر میں مولانا عرشی کے والد، ماموں اور برادرِ نسبتی کے ساتھ گروپ فوٹو بھی ہے۔ان میں زیادہ تو صرف خاندان کے افراد کے پاس ہیں۔کبھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔

۱۹۔مقبرے کی تصویر فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔ان شاء اللہ بعد میں ارسال کروں گا۔

۲۰۔عبدالحمید صاحب، مولانا عرشی پر جو مقالہ لکھ رہے ہیں، اس کا پہلا باب حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جیسے ہی دستیاب ہوگا، ان شاء اللہ روانہ کروں گا۔

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔والسلام

نجف عرشی

۵ ستمبر ۲۰۱۵ء

حاشیہ:

(۱) راقم نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی معروف اور گراں قدر کتاب اردو اور افغان کی ترتیب و تہذیب کی اور اس کے مختلف مقامات پر توضیحی حواشی اور تعلیقات لکھے۔مولانا نے پشتو کے وہ الفاظ، جو اردو میں مستعمل ہوئے، کا انتخاب کیا اور ان کی معنویت کو واضح کیا۔اُن سے بعض الفاظ کے معانی کے تعین اور بعض الفاظ کے تلفظ میں اغلاط بھی سرزد ہوئیں۔راقم نے نہ صرف ان اغلاط کی تصحیحات کیں، بلکہ پشتو ادبیات کے قدیم و جدید مآخذ کی روشنی میں اسناد بھی فراہم کیں۔مولانا کے احوال و آثار کی ترقیم کے لیے مختلف منابع سے استفادہ کیا گیا۔خاص طور پر ان کے صاحبزادے ڈاکٹر نجف علی خاں سے ایک تحریری مکالمہ بھی ہوا۔اس مکالمے میں ان کے عزیز و اقارب کے حوالے سے بعض نئی معلومات سامنے آئیں، جو اس سے قبل ان کے سوانح نگاروں کے علم میں نہیں تھیں۔

ہر زن موسے شکر جاری ہے — فاضل و مولوی کی شادی کا
عرشیوں مین بھی غل ہوا ہے نون — امتیاز علی کی شادی کا

جناب معظم۔

بتقریب سعید شادی خانہ آبادی نور نظر امتیاز علی خان عرشی
بتاریخ ۵ ماہ شعبان ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۴ ماہ نومبر ۱۹۳۳ء
روز جمعہ وقت صبح بخانۂ غریب تشریف ارزانی فرما کر
طعام ماحضر تناول فرما کر بندہ کو ممنونیت کا موقع دیا جائے۔

رواق منظرِ چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

المکلف

محمد مختار علیخان منسرم اصطبل ریاست رامپور

سہیل عباس
استاد شعبۂ اردو، جامعۂ ٹوکیو برائے مطالعات خارجی، جاپان

نور افشاں ۔ایک قدیم اردو اخبار

Suhail Abbas
Professor, Tokyo University of Foreign studies, Japan

Abstract: The researcher has introduced an old newspaper *Nur Afshan*. The objective of publication of this newspaper was preaching of Christiainity. This newspaper had been published from March 1873 to December 1944. The author has mentioned the total number of available volumes of this , which are 3045. The study of this newspaper is helpful for in the comprehension journalism and colonialism of the 19th century.

نور افشاں تقسیم ہند سے قبل شائع ہونے والے اخبارات میں سے ایک اہم اخبار تھا۔ یہ اخبار بنیادی طور پر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے شائع ہوتا تھا، لیکن اس میں سیاسی مباحث، مثلاً: خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ، پہلی جنگِ عظیم، مذہبی مباحث میں عیسائیت وغیرہ بھی شامل ہوتے تھے۔ اس میں انتظامی امور کی خبریں بھی ہوتی تھیں اور ادبی شذرات بھی۔ برٹش لائبریری نے اسے EAP 660 (۱) کے تحت برقی کتب کے ذخیرے میں محفوظ کیا ہے۔ البتہ اس کے دو شمارے دستیاب نہیں ہیں: (i) جولائی ۱۹۱۱ء: جلد ۳۹: شمارہ نمبر ۲۹ (ii) جولائی ۱۹۱۱ء: جلد ۳۹: شمارہ نمبر ۳۰۔ دستیاب شماروں کی تعداد تین ہزار پینتالیس (۳۰۴۵) اور صفحات اکیس ہزار تین سو اکسٹھ (۲۱۳۶۱) ہے۔

نور افشاں کا مطالعہ نہ صرف انیسویں صدی کی صحافت میں مفید ہے، بلکہ اس سے نو آبادیات کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے۔ سب سے پہلے ہم اس کے اغراض و مقاصد کا جائزہ لیتے ہیں۔

نور افشاں کا پہلا شمارہ، لودھیانہ سے ۶ / مارچ ۱۸۷۳ء کو شائع ہوا، جس کی قیمت تین پائی تھی اور آخری دستیاب پرچہ دسمبر ۱۹۴۴ء، جلد ۷۳، شمارہ ۲۵ ہے۔ پہلا شمارہ چار صفحات پر مشتمل تھا۔ پہلے صفحے پر ایک اشتہار بعنوان 'اعلان اخبار نور افشاں' چھپا تھا۔ اس کے مندرجات درج ذیل ہیں:

> ''امرائے نامدار اور روسائے عالی دیار و امصار پر ظاہر و باہر ہو کہ ملک ہندوستان جب سے زیر دست حکومت سرکار نامدار انگلشیہ ہوا ہے، تب سے ہنوز اخبارات کی ترقی دن بدن کثرت پر ہے۔ اگر چہ وہ کثرت اس قدر بے شمار ہے کہ حدِ بیان سے باہر ہو، مگر تا ہم بھی اُس کا بیان طوالت رکھتا ہے۔ علاوہ انگریزی اخباروں کے اردو زبان کے بھی اخبار بہت طبع ہو کر شائع ہوتے ہیں کہ جن میں مضامین رنگین

مختلف اور خبریں بنظرِ فوایدِ علوم درج ہوتے ہیں اور ترغیب تہذیب الاخلاق اور فوایدِ علوم وفنون اور ترقیاتِ تجارت و زراعت اور ترمیمِ رسومات دینی و دنیوی اور تعلیم نسواں و اطفال اور حرفت کاری وحکمت اور خوشنودیِ حکام و بہبودیِ رعایا اور انتظامِ ملکی واستقامتِ ریاست وآسودگیِ معاش وآسائشِ خانگی وغیرہ کے باب میں تذکرہ ہوتا ہے کہ جسے ایک عالم کو فیض پہنچتا ہے اور اُن اخبارات کے صاحب مہتمم اور صاحب اڈیٹر کمالِ دانائی کو کام فرما کر اپنے اپنے رائے روشن سے مشاہیر عام کی طرح خاص وعام کو صلاح دیتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی اخبارات کے آگے اور کسی نئے اخبار کا فروغ پانا سورج کو چراغ دکھانا ہے اور اُن کے خیالاتِ متین کے روبرو ایک طرح کی خفت اٹھانا ہے، لیکن اُن کی توجہات اور پرتوِ کمالات سے کیا بعید ہے کہ یہ اخبار اُن سے اقتباس حاصل کر کے اپنے میں روشنی پیدا کرے اور اُس روشنی کی تجلیات کا مطلعِ انوار ہو جائے۔ لہذا اِس غرض سے صاحب مہتمم اخبار نے ایک اخبار الموسوم اخبار نور افشاں کا اجراء کیا ہے کہ جس میں ہر ایک معاملہ کا تذکرہ بلاتعصب وطرفداری بیان ہوگا اور بایں ہمہ قیمت بنظر کفایت خریداروں کی طرف ایک آنہ ماہیانہ مقرر ہے، کیونکہ اکثر غریب وغرباء جو شائقین اخبارات ہیں اور بباعثِ گرانی قیمت کے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے ہیں اور اخبار کے سیر ومطالعہ سے محروم، مگر یہ اخبار ہفتہ میں ایک بار شائع ہوگا اور ہر ایک صاحب مہتمم اخبار کی خدمتِ عالی درجت میں التماس ہے کہ وہ از راہ توجہاتِ دوستانہ اِس اشتہار واعلان کو اپنے اپنے اخبار مطلع انوار کے کسی گوشے میں جگہ دلائیں اور صاحب مہتمم کو اپنا اپنا مرہون واحسان فرمائیں۔ العبد۔ صاحب مہتمم اخبار نور افشاں مشن پریس، لودیانہ [کذا]۔'' (۲)

پہلے اکیس شمارے چار صفحات پر مشتمل تھے۔ بائیسویں شمارے سے ضخامت آٹھ صفحات کر دی گئی، لیکن قیمت وہی تین پائی رہی۔ تیئیسواں شمارہ چھے صفحات پر مشتمل تھا۔ چوبیسواں پھر چار۔ اسی طرح کئی بار صفحات کی تعداد بیس تک جا پہنچتی تھی اور اکثر چار صفحات کے ضمیمے بھی شائع ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض انگریزی اور بعض اردو زبان میں ہوتے تھے۔ وقت کے ساتھ جوں جوں صفحات بڑھتے گئے، قیمت بھی بڑھتی گئی۔ ۱۹۴۴ء میں اس اخبار کی قیمت دو روپے تھی۔

نور افشاں میں اڈیٹوریل کے عنوان سے اداریہ بھی لکھا جاتا تھا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۴ء کا اداریہ کرسمس کے حوالے سے تھا۔ اس کا عنوان تھا: بڑا دن مبارک ہو۔ (۳)

نور افشاں میں الفاظ پر اعراب کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا، خصوصاً تراکیب کے استعمال میں۔ انگریزی ناموں کے صحیح تلفظ کے لیے قوسین میں انگریزی میں بھی لکھے جاتے تھے، مثلاً: ''سوویٹ اخبار (IZVESTIA) نے اعلان کرتے ہوئے کہا ہے۔۔۔''، اس لیے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں املا اور تلفظ کا ایک خاص اہتمام ملتا تھا، جو آج کی اردو

صحافت میں ناپید ہے۔(۴)

اس اخبار کی زبان میں فارسیت زیادہ ہے، نیز قوافی کا التزام بھی ملتا ہے۔ برکاتِ حکومتِ انگلشیہ تو بہت سوں نے بیان کی ہیں، یہ اخبار بھی انگریزوں کی وکالت میں کم نہیں تھا۔ ایک مثنوی ملاحظہ ہو۔

سب اہلِ ہند کو اِس بات کی شکایت ہے
کہ یورپین کی کیوں ہم پہ کم عنایت ہے
جو بے غرض بھی کوئی اُن سے ملنے جاتا ہے
تو روکھی باتوں سے لب خشک ہو کر آتا ہے
سب اہلِ ہند جو شاکی ہیں اس رکاوٹ کے
تو دل میں سوچتے ہیں سب سبب ملاوٹ کے
پتا جو اُن کے تنفر کا کچھ نہیں لگتا
تو وہم ہوتے ہیں دل میں ہزارہا پیدا
کوئی کہے ہے کہ ہم کالے لوگ ہیں محکوم
ہماری ہستی ہے گوروں کی آنکھ میں معدوم
وہ کالا آدمی کہہ کر پکارتے ہیں ہمیں
ہر ایک بات میں تند ہو کے جھاڑتے ہیں ہمیں
کوئی کہے ہے کہ بولی ہماری ہندی ہے
عجب نہیں کہ یہی وجہ ناپسندی ہے
جو لوگ کرتے ہیں انگریزی پڑھ کے کچھ گِٹ پِٹ
سو بیٹھ رہتے ہیں آخر کو وہ بھی کچھ مِٹ مِٹ
بغور دیکھا تو آخر یہی نظر آیا
کہ دراصل یہی شاید سبب ہے نفرت کا
بدونِ میم کے مجلس میں اور خلوت میں
اکیلے رہتے نہیں ہیں کسی وہ حالت میں
جو ایسے خرقۂ عادت سے ہوں جدا یارو

اسی سبب سے نہیں غیر پر پیار اُن کو
وہ اپنے آپ میں پورا کو رکھتے ہیں اخلاق
ادھورے لوگوں پہ فرمائیں کس طرح اشفاق
کم التفاتی کا شکوہ تو اُن سے بے جا ہے
کہ دو ہیں ایک طرف، اک طرف اکیلا ہے
جو خلط ملط رکھا چاہیں لوگ اُن کے ساتھ
تو لازم ہے کہ وہ ہمدم کو لے کے آئیں ساتھ
تو پھر وہ دیکھیں کہ کیسی عنایت ہو اُن پر
ہر ایک بات میں ظاہر حمایت ہو اُن پر(۵)

ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں، یہ دو تہذیبوں کا فرق ہے، جسے مٹایا نہیں جاسکتا اور یہ ویسے بھی نوآبادیات کے حوالے سے ایک الگ موضوع ہے کہ مغربی تہذیب کے کتنے اثرات مشرقی تہذیب پر مرتب ہوئے؟

نورافشاں کے موضوعات:

نورافشاں میں کتابوں پر تبصرہ بھی کیا جاتا تھا، مثلاً: ڈبلیو ایم رائبرن، ایم اے کی کتاب مسیح اور انسان پر تبصرے کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں۔ اس کی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال عام اخباری زبان سے بالکل مختلف ہے:

> ''یہ واقعہ ہے کہ مضامین کتابِ ہذا اپنی نوعیت میں معرفت خیز اور حقیقت بیز ہیں۔ مؤلف نے ان مضامینِ بائبل کو، جو انسانی ذہنیت سے بلحاظِ مفہوم و حقیقت غیر قریب تھے، اپنی قابلیت کی بنا پر اور بہ امدادِ خداوند انسانی تفہیم و تفاہم کے لیے قریب تر کر دیا ہے۔ مسائلِ الٰہیات، جو بائبل میں بصورتِ استعارہ و بشکلِ ایما تھے، ان کی تفسیر عام فہم زبان میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ کی ہے، جس سے مفہومِ کلام، جو ضمناً کتابِ مقدس سے تصور ہو سکتا تھا، صحیح طور پر صفحۂ حقیقت پر واضح ہو گیا ہے۔''(۶)

اس اخبار میں بھی اشتہارات بھی دیے جاتے تھے، ایک اشتہار کے مشمولات ملاحظہ ہوں:

''ہماری تازہ ترین مطبوعات: ذیل کی نادر الوجود اور عالمانہ کتب حال ہی میں چھپی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ذوقِ مطالعہ اور معلومات کے لیے یہ کتابیں بیش بہا ثابت ہوں گی۔ مسیحی علوم پر اگر عبور حاصل کرنا ہو تو ان کتابوں کو منگوا کر خود بہرہ انداز ہو جیے اور اپنے دوستوں اور غیر مسیحوں کو ان سے متمتع کیجیے۔

بقائے روح از پادری سلطان محمد صاحب پال، پروفیسر ایف سی کالج لاہور۔ کتابِ ہذا میں روح کے معاملہ پر ایک نہایت ہی جامع اور بسیط بحث کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی لگایا جاسکتا

ہے۔ص ۱۵۲۔

بہترین مسیحی گھر مصنفہ بیگم ایف ڈی وارث صاحبہ۔ جتنے مسیحی ریویو مسیحی جرائد میں شاید اس کتاب پر لکھے گئے ہیں، کم ہی اور کتابوں کے حصہ میں آئے ہیں۔ اگر ازدواجی اور خانگی زندگی کو مسیحی معیار کے مطابق قائم رکھنا مقصود ہو تو اس کتاب کو پڑھنے اور عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔

کتاب مقدس کا مسلسل بیان مصنفہ پادری چارلس فوسٹر صاحب۔(پیدائش سے لے کر مکاشفہ تک) بائبل مقدس کو جاننے کے لیے اس کتاب کی رہنمائی ضروری ہے۔ ۵۷۶ صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔

بن حور: پبلک کے اصرار پر اسے دوسری مرتبہ چھپوایا گیا ہے۔ اس میں جس انداز میں حضور پرنور جناب خداوند کے سوانح حیات ہیں، وہ بہت ہی دلفریب ہے۔ صفحات ۳۷۶۔ لکھائی چھپائی دلفریب۔

ان کے علاوہ کلیسائے عربستان کی تاریخ، کلیسا کے نورتن، دہانِ شیر، شہیدانِ کارتھیج زیرِ طبع ہیں، جو بجلد پبلک کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ پروفیسر علامہ لطفی لیونان کے ٹریکٹ عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ ہر پڑھے لکھے مسیحی کا فرض ہے کہ ان ٹریکٹوں کے ذریعے اپنے معلومات بڑھا کر غیر مسیحوں میں خداوند کی بادشاہت کی توسیع کے لیے کوشاں ہو۔ ان کی قیمت صرف انی ٹریکٹ ہے اور دینی معلومات کا سب سے عمدہ آلہ ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مسیحیوں میں بشارت کے لیے ہمارے اپنے تیار کردہ بہترین پوسٹر ہیں۔ ہماری تازہ ترین فہرست طلب کر کے ہم سے کتابیں منگوائیے۔ المشتہر سیکرٹری پنجاب رلجیس بک سوسائٹی، انارکلی، لاہور۔'' (۷)

دیکھا جائے تو یہ اشتہار صرف کتابوں کے ناموں پر ہی مشتمل نہیں، بلکہ ان پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی قیمتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

اس اخبار میں ایک گوشہ مراسلات کا بھی ہوتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے اس اخبار میں شائع ہونے والی عیسائی تبلیغ کے لیے اسلامی اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک مراسلہ کا عنوان ہے: میلادِ شریف ۔عبارت آرائی ملاحظہ ہو۔

''اب دیکھیے کہ ہم بڑے دن کی صبح کیا کیا کرتے ہیں۔ صبح ہی لوگوں کے گھروں میں مختلف چیزیں نوکروں کے ہاتھ، یا ڈاکیہ [کذا] کے ساتھ بڑے دن کا پارسل، یا بڑے دن کا کارڈ مبارکبادی لفافوں میں بھیجتے ہیں اور بہت سے لوگ صبح ہی اپنے محلے کے لوگوں کو مختلف چیزیں دیتے اور ہندو اپنے اپنے سرکاری افسروں کو نذر و تحائف دیتے ہیں اور پھر لوگ نہا دھو کر بڑے دن کے طرح طرح کے لذیذ کھانے کھا کر جن کو ناظرین سب سمجھتے ہیں، مثلاً: کیک، مٹھائی، پلاؤ، قورما وغیرہ وغیرہ اڑا کر کوئی دس گیارہ بجے بڑے دن کی تیاری کرتے ہیں اور وہاں عجیب طرح طرح کی صورتیں اور خاکی مورتیں گوناگوں رنگوں کے لباس میں خداوند تعالیٰ کی حمد میں تیار ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ سال بھر کی کمائی ایک غریب سے غریب عیسائی اسی

خوشی کے موقع پر لگا دیتا ہے۔ خیر جو کچھ ہو سنجیدگی کے ساتھ اس کے جلال کے لیے ہوتا، اس کی خوشی پورے طور سے منائی جاوے۔ صرف ان چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ کیونکہ دیگر اصحاب نے بھی رنگین اور مقفی عبارتوں سے میلا دشریف پر کالم مرصع کیے ہیں۔ فقط۔" (۸)

مقامی خبروں کے لیے گلدستۂ اخبار اور عالمی خبروں کے لیے تار و برقیات کے نام سے گوشے ہوتے تھے۔ عالمی خبروں میں تاریخوں کے اندراج کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً: جاپان میں کاگوشیما (Kagoshima) کے مقام پر ۱۲ر جنوری ۱۹۱۴ء، صبح نو بج کر اٹھائیس منٹ پر چھ [چھے] اشاریہ سات میگنی ٹیوڈ آنے والے زلزلے کی خبر یوں بیان کی گئی ہے:

"۱۳ر جنوری کاگوشیما (جاپان) جزیرہ ساکرشیما میں سنیچر میں سنیچر کے روز سے ساٹھ زلزلے واقع ہو چکے ہیں اور ہر روز ہیبت ناک طور پر مختلف مقامات میں زمین پھوٹتی رہی۔ ایک گاؤں تو بالکل تباہ ہو گیا ہے اور دیگروں کی بابت احتمال ہے کہ وہ بھی برباد ہو گئے ہیں۔ شعلہ زن لاوا شہر کاگوشیما تک پہنچ گیا ہے۔ حالت بہت ہی خطرناک ہے اور نقصان بے قیاس ہو گیا ہے اور جاپانی دخانی جہاز بڑی سرعت کے ساتھ رقبات متاثرہ کو روانہ ہو گئے ہیں۔ ۱۳ر جنوری ٹوکیو ساکرشیما میں جو ابھار او ظہور میں آئے ہیں۔ اُن میں سے بڑے پتھر نکل کر ۲۰۔۳۰ میل کے فاصلہ پر جا پڑے ہیں۔ سارا جزیرہ جل اُٹھا ہے۔ کاگوشیما سے ۷۰ ہزار آدمی بھاگ گئے ہیں، مگر صرف محکمہ تار برقی ہی وہاں باقی ہے۔ سارا شہر لاوا کی راکھ سے ڈھنپا پڑا ہے۔ ابھی تک معلوم نہیں کہ کس قدر جانیں ہلاک ہو چکی ہیں؟ اس پر اضافہ اور ہوا کہ کاگوشیما میں بحری مد کی ایک ایک رو نے آکر اور غضب ڈھایا، جس کے سبب سے اس شہر میں مال و جان کا سخت نقصان ہو گیا ہے۔" (۹)

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی کوریج بھی اس اخبار میں بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔

اس اخبار میں سروے بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ سروے مردم شماری کی بنیاد پر ہوتے تھے، مثلاً: ایک سروے کے مندرجات ملاحظہ ہوں۔ عنوان ہے: ہندوستان میں خواندہ مستورات اور مندرجات یہ ہیں:

"وہ بھی دن تھا کہ لکھنا پڑھنا مستورات کے لیے معیوب اور مضر سمجھا جاتا تھا اور ہندو مسلمان اس نیک کام پر عمل پیرا ہونے سے احتراز کرتے تھے، مگر جہاں شکر کا مقام ہے کہ یہ احتراز دن بدن دور ہوتا جا رہا ہے اور ان ۔۔۔ تعلیم النسواں کی جانب بڑھ رہا ہے، وہاں افسوس بھی ہے کہ اس مرحلہ میں ترقی بہت ہی کم ہے۔ چنانچہ گذشتہ مردم شماری کے رو سے خواندہ مستورات کی تعداد فی ہزار حسب ذیل ہے:

کل	صوبہ کی زبان	دیگر زبانیں	انگریزی
عیسائی	۱۲۵	۷۴	۶۱۵
بودھ	۴۲	۴۲	

جین	۱۸	۱۷	۱
سکھ	۷	۷	'
ہندو	۵	۴	۱
مسلمان	۳	۲	۱
دیگر			

شکر اور خوشی کی بات ہے کہ مسیحی مستورات کی تعداد نسبتاً ہمت افزا ہے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی تک تسلی بخش حالت نہیں ہے۔ ہزار پیچھے ۱۲۵ کی کیا حقیقت ہے؟ مسیحوں کو اس طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے، کیونکہ مستورات ہی قوم اور مذہب اور گھر اور مجلس کی ترقی کی جان ہیں۔" (۱۰)

ادبی طور پر بھی اس اخبار کی بڑی خدمات ہیں۔ سب اہم بات یہ ہے اس اخبار میں ان مقامی عیسائی شاعروں کا کلام ملتا ہے جن کا ابھی تک کوئی تذکرہ شائع نہیں ہوا۔ یہ کلام مختلف صورتوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اس کے لیے ایک گوشہ شعر و سخن کے نام سے بھی اس اخبار میں وقف تھا۔ واضح ہو کہ زیادہ تر کلام مذہبی نوعیت کا ہے، جو عیسائیت سے متعلق ہے۔

'ضرورت' کے اشتہارات بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ان اشتہارات میں بھی عیسائیوں کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے انگریزی دور میں مقامی عیسائی، ہندوؤں اور مسلمانوں سے خود کو برتر سمجھتے تھے۔ ایک اشتہار ملاحظہ ہو:

"کوئٹہ میں پرائمری اسکول کے واسطے ایک مسیحی اردو مڈل پاس کی ضرورت ہے، جو اچھوت ذات کے لوگوں میں کام کرنے میں رضامند ہووے اور تجربہ کار ہو، مع سرٹیفکیٹ ذیل کے پتہ سے خط و کتابت [کذا] کرے۔ مینیجر نور افشاں، لودیانہ [کذا]"۔

مجموعی طور پر یہ اخبار نہ صرف ادبی زبان کا مجموعہ ہے، بلکہ اردو کی عیسائی مذہبی شاعری کے ایک غیر مرتب تذکرے کا اہم ماخذ بھی ہے۔ اس اخبار میں توریت کا منظوم ترجمہ بھی چھپا تھا، جو منشی اشرف علی اشرف نے کیا تھا۔ یہ اخبار محققین کو دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ (۱۱)

ذیل میں کچھ کلام بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ کلام چونکہ تمام نور افشاں سے لیا گیا ہے، اس لیے حوالے کے لیے قوسین میں جلد، شمارہ اور سنہ دیا جا رہا ہے:

بی۔ این:

نظم:

ایک نیا مسیحی گیت ہندوستانی راگ پر

(نور افشاں ۳:۱۶:۱ اپریل ۱۸۷۵ء)

منشی حسن علی سفیر، نصیر آباد:

غنچۂ لب بستہ دل کا دانہ یہاں اک دم رہا
گلشنِ گیتی میں ہر دم خوفِ خارِ غم رہا

(نور افشاں: ۴:۱۴: اپریل ۱۸۷۶ء)

جیمس امریل گل، روڑکی:

غزلیں:

تو گر شکل اپنی دکھاتا رہے گا
تو دل کو مرے صبر آتا رہے گا

(نور افشاں: ۴:۱۶: اپریل ۱۸۷۶ء)

نہیں پیدا ہوا عالم میں کوئی اس کا ثانی ہے
میرا مونس میرا ہمدم میرا وہ یارِ جانی ہے

(نور افشاں: ۵:۱۴: اپریل ۱۸۷۷ء)

اس شعلہ رو کی شکل پہ جلوہ الٰہی ہے
پروانہ اس کے حسن کی ساری خدائی ہے

(نور افشاں: ۵:۱۵: اپریل ۱۸۷۷ء)

دل تو کیا جاں تک بھی تجھ کو اے صنم دے دیں گے ہم
شوق سے لیجیے بلا دام و درم دے دیں گے ہم

(نور افشاں: ۵:۱۶: اپریل ۱۸۷۷ء)

کیا جس پر نثار اے دل یہ ہم نے تن بدن اپنا
وہی ہے محرمِ رازِ نہاں غنچہ دہن اپنا

(نور افشاں: ۵:۱۷: اپریل ۱۸۷۷ء)

خار دل پر تیری فرقت کا کھٹکتا جائے گا
تجھ بغیر از اے مسیحا جی بھٹکتا جائے گا

(نور افشاں: ۵:۱۶: اپریل ۱۸۷۷ء)

اسیرانہ اجل کو پہنچی بوئے جانفزا کیسی
گلِ روح خزاں دیدہ کو ہے جیسے فزا کیسی

(نورافشاں :۲:۱۵:۱اپریل۱۸۷۸ء)

رخِ عیسیٰ کا میسر جو نظارا ہوجائے
مشکل آسان ہو سب کام ہمارا ہو جائے

(نورافشاں :۲:۱۷:۱اپریل۱۸۷۸ء)

بیبل کی ہے بے شبہ ہر اک پاک عبارت
بے جس کے تلاوت نہیں مقبولِ عبادت

(نورافشاں :۷:۱۶:۱اپریل۱۸۷۹ء)

ہے خطا اپنی ہی اے دل یہ سزا کا باعث
کچھ نہیں اور ہے خفگیِ خدا کا باعث

(نورافشاں :۷:۱۷:۱اپریل۱۸۷۹ء)

ہو چکا ہم کو ہر اک طرح سے بس یہ تحقیق
نہیں جز نامِ خدا کوئی یہاں اور شفیق

(نورافشاں :۸:۱۵:۱اپریل۱۸۸۰ء)

یادِ حق کر لے کوئی دم ورنہ پھر پچھتایئے گا
تو مسافر ہے یہاں آخر سفر کر جایئے گا

(نورافشاں :۹:۱۴:۱اپریل۱۸۸۱ء)

رخصت سرا سے ہوجو ہم اپنے مکاں چلے
ہمراہ سب عزیز بھی کرتے فغاں چلے

(نورافشاں :۹:۱۶:۱اپریل۱۸۸۱ء)

نظمیں:

خدا کی ازلیت وابدیت :

(نورافشاں :۵:۱۵:اپریل ۱۸۷۷ء)

خیال:

(نورافشاں :۷:۱۵:اپریل ۱۸۷۹ء)

بھجن پھاگن کی لے میں :

(نورافشاں :۹:۱۴:اپریل ۱۸۸۱ء)

رحمت مسیح ،امرتسر:

غزل:

ہمارا دوست ہے عرش بریں پر
وہ آ کر تھا بنا خاکی زمیں پر

(نورافشاں :۴:۱۷:اپریل ۱۸۷۶ء)

منشی حسن علی سفیر ،نصیر آباد:

غزل:

رخ عیسیٰ کا میسر جو نظارہ ہو جائے
رشکِ صد مہر ہر اک عرش کا تارا ہو جائے

(نورافشاں :۶:۱۴:اپریل ۱۸۷۸ء)

سلام:

سلامی کو دنیا میں کیا چاہیے
بس اک مدحِ عیسیٰ کیا چاہیے

(نورافشاں :۶:۱۷:اپریل ۱۸۷۸ء)

منشی اشرف علی اشرف:

توریت کا منظوم ترجمہ، باب اول:

کیا روشنی کو اندھیرے سے دور

اسی دم ہویدا ہوا تیرا نور

(نورافشاں :۸:۱۸:۱۸۸۰ء)

خدایا تو ہے پاک پروردگار
ہر ایک امر میں تجھ کو ہے اختیار

(نورافشاں :۸:۱۶:اپریل ۱۸۸۰ء)

حوالے:

http://eap.bl.uk/database/results.a4d?projID=EAP660_۱

۲۔ نورافشاں : جلد۱: شمارہ۱: مارچ ۱۸۷۳ء: ص ۱ و ۲۔

۳۔۔۔۔۔: جلد۷۳: شمارہ ۲۵: دسمبر ۱۹۲۴ء: ص ۲۔

۴۔۔۔۔۔: جلد۷۳: شمارہ ۲۵: دسمبر ۱۹۲۴ء: ص ۲۔

۵۔۔۔۔۔ : جلد۱: شمارہ۱: مارچ ۱۸۷۳ء: ص ۳۔

۶۔۔۔۔۔ : جلد۷۳: شمارہ ۲۵: دسمبر ۱۹۲۴ء: ص ۲۔

۷۔۔۔۔۔ : جلد۷۳: شمارہ ۲۴: یکم دسمبر ۱۹۴۴ء۔

۸۔۔۔۔۔ : جلد۴۱: شمارہ ۵۲: ۲۶ر دسمبر ۱۹۱۴ء۔

۹۔۔۔۔۔ : جلد۴۲: شمارہ ۳: ۱۶ر جنوری ۱۹۱۴ء۔

۱۰۔۔۔۔۔: جلد۴۲: شمارہ ۸: ۲۰ر فروری ۱۹۱۴ء۔

۱۱۔۔۔۔۔ : جلد۴۲: شمارہ ۱۰: ۶ر مارچ ۱۹۱۴ء۔

استدراک:

فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے میں نورافشاں کا محض تعارفی اور سرسری مطالعہ کیا ہے، حالانکہ انھیں اس اخبار کے مندرجات اور ان کے بین السطور موجود فضا کو منکشف کرنا چاہیے تھا کہ اس اخبار نے انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلم بیانیے کو کس طرح نقصان پہنچایا؟ اس اخبار کے اغراض و مقاصد کے تناظر میں کچھ اہم اور بنیادی حقائق سے پردہ اُٹھایا سکتا تھا، مگر انھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہ اخبار عیسائیت کی تبلیغ اور انگریزی راج کی ترقی اور کامرانی کے لیے کوشاں رہا۔ اس حوالے سے اس کے مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔

دوسرا یہ کہ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس اخبار میں الفاظ اور تراکیب پر اعراب لگانے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ الفاظ و تراکیب پر اعراب لگانا، درست املا کا خیال رکھنا اور وقف نگاری کا التزام کرنا بہت مستحسن عمل ہیں، مگر فاضل مقالہ نگار کو اس نکتے پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ وہ تمام اردو کتابیں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی، یا انگریز سرکار کے زیرِ اہتمام شائع ہوئیں، ان میں الفاظ پر اعراب نگاری کا خاص خیال رکھا گیا، مگر کیوں؟ کیا اس کا مقصد اردو زبان کو صحت کے ساتھ ترویج دینا تھا، یا پھر کچھ اور۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اعراب کے بغیر اردو زبان پڑھنا اور سیکھنا کمپنی کے یورپی ملازمین (اور بعد ازاں انگریز سرکار کے کارپردازوں) کے لیے مشکل تھا، اس لیے ایسے تمام ذرائع بروئے کار لائے جاتے تھے، جو لفظ شناسی اور آموزشِ زبان کے باب میں معاون ہو سکتے تھے۔ اس کا اردو کی ترویج اور ترقی سے شاید کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج پریس سے چھپنے والی کتابیں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ ان سارے عوامل میں درپردہ مقاصد کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ تیسرا یہ کہ اس اخبار نے اسلامی اصطلاحات کو ایک نئے تناظر میں برتنے کی کوشش کی۔ بعض مخصوص اصطلاحوں کو دوسرے مذاہب کے لیے برت کر ان کی معنویت کو تعمیمی رنگ میں بیان کرنا بھی کسی سازش سے کم نہیں۔ اس اخبار کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے اس کے غائر مطالعے کی ضرورت ہے۔ اگر فاضل مقالہ نگار اس اخبار کے مندرجات کو اس کے اغراض و مقاصد کے تناظر میں اپنے مقالے کا موضوع بنائیں تو تعبیر کے صفحات حاضر ہیں۔

نور افشاں اردو اخبار تھا، لیکن کبھی کبھی اس کے انگریزی ضمیمے بھی شائع ہوتے تھے۔ البتہ ۱۸۹۷ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی مسلسل چھپتا رہا۔ یہ اخبار پریس بائی ٹیرین مشن (Presbyterian Mission) پنجاب کا ترجمان تھا اور بیک وقت لدھیانے، انبالے اور لاہور سے اشاعت پذیر ہوتا تھا۔ اصلاً ہفت روزہ تھا، لیکن کبھی کبھی پندرہ روز کے بعد بھی چھپتا تھا۔

نور افشاں تہتر (۷۳) جلدوں میں ایف سی کالج (اے چارٹرڈ یونیورسٹی) کی دی ونگ میموریل لائبریری میں محفوظ ہے۔ البتہ ان جلدوں میں مندرجہ ذیل شمارے نہیں ہیں:

vol 2-1874, vol 14-1886, vol 16-1888, vols 20-21-1892-93, vol 5-1901 (Eng ver), vol 36-1908, vol 43-1915, vols 47-49- 1919-21, vol 51-1923, vol 56-1928, vol 60-1932, vol 64-1936, vol 68-1940 and vol 71-1943.

(مدیر)

محمد شعیب
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اشرف صبوحی کے میر ٹوٹرو اور آسکر وائلڈ کے The Devoted Friend میں حیرت انگیز مماثلت۔ایک تقابلی مطالعہ

Muhammad Shoaib.
Ph.D Scholar, department of Urdu,AIOU, Islamabad.

Abstract: Ashraf Sabohi was the well known Urdu prose writer. His sketch's books are very famous in Urdu literature and he has a large circle of readers. His sketch's book دِلّی کی چند عجیب ہستیاں was published in 1943.

In this book, a sketch about "Mir Totroo" is a controversial because Oscar Wilde wrote a same story entitled "The Devoted Friend" in 1888. It's not just replication, rather the theme, characters, texture, events, conversations and even many statements are common.In this article, the comparative study has been carried out between both of them. Oscar Wild's short story "The Devoted Friend", Ashraf Sabohi's sketch "Mir Totroo" is the primary source for this article and translation in Urdu of "The Devoted Friend" by Ghulam Abbas is the secondary source.

(۱)

اشرف صبوحی ۱۱رمئی ۱۹۰۵ء کو دِلّی میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام سیّد ولی اشرف تھا۔تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں آ گئے۔ان کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے تھا۔۲۲راپریل ۱۹۹۰ء کو وفات پائی اور لیلین آباد کراچی میں مدفون ہوئے۔دِلّی کی چند عجیب ہستیاں ، غبارِ کارواں، جھروکے ان کی اہم تخلیقی کتب ہیں۔انگریزی زبان میں مہارت کی وجہ سے انگریزی ادب کی چند کتابیں اردو زبان میں ترجمہ بھی کیں۔ان کے اہم تراجم: دھوپ چھاؤں ، ننگی دھرتی اور موصل کے سوداگر ہیں۔

آسکر وائلڈ ایک آئرش ادیب اور شاعر تھے۔۱۶راکتوبر ۱۸۵۴ء کو ڈبلن (آئرلینڈ) میں پیدا ہوئے۔ان کی والدہ ایک شاعرہ کے طور پر پہچان رکھتی تھیں، جبکہ والد طب کے شعبے سے وابستہ تھے۔آسکر وائلڈ نے ۳۰رنومبر ۱۹۰۰ء کو

فرانس کے شہر پیرس میں وفات پائی۔انھوں نے ڈراما،افسانہ،مضمون نگاری اور شاعری کی اصناف میں نام کمایا،جن کی تفصیل یہاں طوالت کا باعث ہوگی۔

(۲)

آسکر وائلڈ کی ایک معروف کہانیThe Devoted Friend ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔معروف افسانہ نگار غلام عباس نے جاں نثار دوست کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔۱۹۳۳ء میں یہ ترجمہ حفیظ جالندھری کے مرتبہ مجموعے معیاری افسانے میں شائع ہوا۔اس کہانی کی ابتداء پرندوں اور جانوروں کے مکالموں سے ہوتی ہے۔بلبل، کچھوے کی دوستی کے وعظ کے بعد کہانی سناتا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ایک سادہ لوح شخصHans ہے،جو Miller کی دوستی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔Miller ہر وقت بے لوث دوستی کی اہمیت کا راگ الاپتے ہوئے اس سے اپنے کئی کام نکلوا لیتا ہے اور جب Hans پر مصیبت آتی ہے تو وہ اسے ملنا بھی گوارا نہیں کرتا۔وہ یہی سمجھتا ہے کہ Hansصرف اس کے کاموں کے لیے پیدا ہوا ہے۔وہ وقت دیکھتا ہے،نہ موسم کی سختی کو مدِ نظر رکھتا ہے،بلکہ اسے صرف اپنے کاموں سے غرض ہوتی ہے۔اسی طرح ایک مرتبہ وہ انتہائی نامساعد حالات میں Hans کو رات گئے اپنے ایک ناممکن کام کے لیے روانہ کرتا ہے،جس کی تکمیل کے دوران میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

ادھر ہمارے اشرف صبوحی نے اپنے شخصی مضامین کے مجموعے دِلّی کی چند عجیب ہستیاں (یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو،دہلی سے شائع ہوا) میں ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ کیا ہے،جسے وہ وابستگانِ دِلّی میں شمار کرتے ہیں۔یہ شخصیت میر ٹوٹرو کی ہے اور اسی عنوان سے مذکورہ مجموعے کی فہرست میں آٹھویں نمبر پر موجود ہے۔یہ کہانی نما خاکہ آسکر وائلڈ کی کہانیThe Devoted Friend کا چربہ ہے۔دونوں تحریروں کا مرکزی خیال،کرداروں میں صدفی صد مماثلت، کہانی کی بُنت میں مماثلت،واقعات میں حد درجہ مماثلت،یہاں تک کہ مکالمے اور بیانیے میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

(۳)

ذیل میں مختلف حوالوں سے ان دونوں تحریروں کا تقابل کر کے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اشرف صبوحی صاحب نے میر ٹوٹرو کا افسانہ نما شخصی خاکہ آسکر وائلڈ کی متذکرہ تحریر سے لے کر اپنایا ہے۔اس حوالے سے تفصیلات درج ذیل ہیں:

سب سے پہلے دونوں تحریروں کے کرداروں کا موازنہ کرتے ہیں۔دونوں میں دو دو مرکزی کردار ہیں۔آسکر وائلڈ کے Hans کے مقابلے میں صبوحی صاحب نے میر ٹوٹرو کو متعارف کرایا ہے۔آسکر کے ہاں دوسرا مرکزی کردار Miller کا ہے،جبکہ اشرف صبوحی نے اسے داروغہ سے بدلا ہے۔آسکر نے ضمنی کردار Miller کی بیوی اور چھوٹے بیٹے کا

ذکر کیا تو اشرف صبوحی بھی پیچھے نہیں رہے اور انھوں نے داروغہ جی کی بیوی اور بچے کو سامنے لا کھڑا کیا، یعنی دونوں قصوں میں کم نہ زیادہ، برابر برابر؛ چار چار کردار ہیں۔ آسکر کی کہانی کا اردو میں ترجمہ کرتے وقت غلام عباس Miller کے لیے چودھری اور Hans کے لیے فیروز کا نام استعمال کرتے ہیں۔

دونوں قصوں میں بیان کی گئی کہانیوں کا مرکزی خیال ایک ہے۔ دوستی صرف برابر کی اچھی رہتی ہے۔ بالا دست کی دوستی مہنگی پڑتی ہے۔۔ میر ٹوٹرو، داروغے کے دامِ دوستی میں پھنس جاتا ہے اور وہ ہر وقت ٹوٹرو کو دوستی کی اہمیت بتا کر اُس سے مفت میں اپنے کام لیتا ہے۔ جب موسم کی شدت کے باعث میر ٹوٹرو محتاج ہو کر رہ جاتا ہے تو داروغہ اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتا، مگر جیسے ہی حالات دوبارہ معمول پر آتے ہیں، وہ ٹوٹرو کو اپنے کاموں میں جکڑ لیتا ہے۔ آخرِ کار ایک رات موسم کی شدت کے باوجود وہ اپنی دوستی کا حوالہ دے کر میر ٹوٹرو کو ایک ناممکن کام پر روانہ کرتا ہے، جس دوران میں میر ٹوٹرو کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اشرف صبوحی نے بھی ہو بہو وہی کہانی بیان کی ہے۔ صرف تمہید، جو بطخ، کچھوے اور بلبل کے درمیان ہونے والی گفتگو پر مشتمل ہے، اُسے قلم انداز کیا گیا ہے۔

(۴)

مرکزی خیال، کہانی اور کرداروں میں مماثلت کے بعد مکالمات اور واقعات، یہاں تک کہ بیانیے میں بھی مماثلت ملاحظہ ہو:

آسکر وائلڈ کے Miller کا مکالمہ:

"Real friend should have everything in common."(1)

ترجمہ: ''سچا دوست ہر چیز میں ساجھی ہوتا ہے۔'' (۲)

مکالمے کے بعد آسکر وائلڈ کا بیانیہ ملاحظہ ہو:

"Sometimes, indeed, the neighbours thought it strange that the rich Miller never gave little Hans anything in return, though he had a hundred sacks of flour stored away in his mill." (3)

ترجمہ: ''کبھی کبھی آس پاس کے رہنے والوں کو یہ بات کھٹکتی کہ امیر چودھری نے ننھے فیروز کو کبھی کوئی چیز بدل میں نہیں دی، حالانکہ اس کے گودام میں آٹے کی سیکڑوں بھری ہوئی بوریاں پڑی ہیں۔'' (۴)

اشرف صبوحی کا بیانیہ دیکھیے:

'' ملنے جلنے والوں کو اچنبا ضرور تھا کہ عجب قسم کی دوستی ہے۔ میر ٹوٹرو کی مدارات کے بدلے داروغہ صاحب

امیر ہوتے ہوئے بھی غریب کے ساتھ کوئی سلوک نہیں کرتے۔‘‘(۵)
آ گے چل کر آسکر وائلڈ لکھتے ہیں:

"Miller used to say about the unselfishness of true friendship."(6)

ترجمہ:’’چودھری سچی دوستی کی بے غرضی کی نسبت سنایا کرتا تھا۔‘‘(۷)
صبوحی صاحب اسی مفہوم کو بلا کسی تبدیلی کے یوں بیان کرتے ہیں:
’’وہ ہمیشہ سچی اور بے غرض دوستی پر وعظ کہنے لگتے۔‘‘(۸)
اسی طرح آسکر وائلڈ کا ایک اور مکالماتی انداز اور اس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

"'But could we not ask little Hans up here?' said the Miller's youngest son."(9)

’’چودھری کے سب سے چھوٹے لڑکے نے کہا:’اگر فیروز کے ہاں نہیں جا سکتے تو کیا ہم اُسے یہاں بھی نہیں بلا سکتے‘؟‘‘(۱۰)
اشرف صبوحی نے اس مکالمے کا ترجمہ کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اسے اپنے خاکے میر ٹوٹرو میں یوں برتا ہے:
’’بچہ: اماں مینہ برسنے میں چچا ٹوٹرو کے گھر ہم کیونکر جا سکتے ہیں؟ انھیں یہاں بلا لو نا۔‘‘(۱۱)
Miller اپنی بیوی سے بات کرتے ہوئے (آسکر وائلڈ کے الفاظ میں) کہتا ہے:

"'There is no good in my going to see little Hans as long as the snow lasts,' the Miller used to say to his wife, 'for when people are in trouble they should be left alone and not be bothered by visitors. That at least is my idea about friendship, and I am sure I am right. So I shall wait till the spring comes, and then I shall pay him a visit, and he will be able to give me a large basket of primroses,and that will make him so happy."(12)

ترجمہ:’’جب تک جاڑا پڑتا ہے، ننھے فیروز کے پاس جانا ٹھیک نہیں، کیونکہ جب لوگ مصیبت میں ہوں تو ان سے کنارا ہی کرنا چاہیے اور مل مل کر ان کے دکھوں کو اور بھی بڑھانا نہیں چاہیے۔ بھئی! میرا تو دوستی کے متعلق یہی عقیدہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں راستی پر ہوں، اس لیے میں بہار کے آنے تک اس سے

نہیں ملوں گا۔ وہ گل قند بنانے کے لیے گلاب کے پھولوں سے بھرپور ٹوکرا میری نذر کر سکے تو میں اُس سے ملنے ضرور جاؤں گا اور مجھے پھول دے کر اُسے بڑی خوشی ہوگی۔" (۱۳)

اب 'دِلّی' کی اس 'معروف' شخصیت میر ٹوٹرو کے بارے میں ہندوستانی داروغہ کی گفتگو دیکھیے، جسے صبوحی صاحب نے بلاتکلف اپنے الفاظ میں بدل دیا ہے:

"جب کسی کو تکلیف ہو، چپ چاپ چھوڑ دینا چاہیے، اسی میں راحت ہے۔ ناحق شرمندہ کرنے سے کیا حاصل۔ دوستی کے متعلق کم از کم میرا نظریہ تو یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہے بھی بالکل درست۔ اس لیے برسات بھر تو میں کسی طرح اُن سے ملنے کے لیے تیار نہیں۔ موسم کھل جانے دو۔ اُن کے پنجرے بکنے لگیں۔ چولھا گرم ہونا شروع ہو جائے۔ پھر ہم ویسے ہی دوست ہیں، ہم نوالہ و ہم پیالہ۔ دراصل اُن کو جتنی خوشی کھلانے میں ہوتی ہے، کھانے میں نہیں اور میں اُن کی خوشی چاہتا ہوں۔" (۱۴)

کہانی آگے بڑھتی ہے تو Miller اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

"If little Hans came up here, and saw our warm fire, and our good supper, and our great cask of red wine, he might get envious, and envy is a most terrible thing, and would spoil anybody's nature. I certainly will not allow Hans' nature to be spoiled. I am his best friend, and I will always watch over him, and see that he is not led into any temptations. Besides, if Hans came here, he might ask me to let him have some flour on credit, and that I could not do. Flour is one thing and friendship is another."(15)

ترجمہ: "ارے! اگر ننھا فیروز یہاں آجائے اور ہمارے ہاں کا گرم چولھا، ہمارا لذیذ چٹ پٹا کھانا اور مکھن سے بھرا ہوا مٹکا دیکھ لے تو کیا عجب اُس کا دل للچا جائے اور وہ ہم سے حسد کرنے لگے۔ حسد سب سے خوفناک شے ہے۔ یہ آدمی کی فطرت کو تباہ اور برباد کر دیتا ہے اور میں فیروز کا ہمدرد ہوں؛ اُس کا سچا دوست ہوں، بھلا میں کیونکر گوارا کرلوں کہ اس کی فطرت تباہ ہو؟ اس لیے میں اُسے کبھی ایسا موقع ہی نہ دوں گا، جس سے وہ کسی ترغیب میں مبتلا ہو۔ اس کے علاوہ اگر ننھا فیروز آئے تو کیا معلوم وہ مجھ سے تھوڑا سا آٹا اُدھار مانگ بیٹھے اور یہ مجھ سے کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ آٹا اور چیز ہے اور دوستی اور چیز۔" (۱۶)

اشرف صبوحی دہلوی، داروغہ جی کی زبان سے یہی باتیں اِن الفاظ میں کہلواتے ہیں:

''وہ آئے تو کیا ہم اپنی حالت پر پردہ ڈال لیں گے؟ ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا، آمدنی خرچ سب اُن کے سامنے ہوگا۔ وہ سوچیں گے کہ داروغہ جی کیسے عیش میں ہیں؟ کتنا بڑا مکان ہے؟ کیسی راحتیں؟ بیسیوں سپاہی خدمت میں حاضر؛ شہر بھر پر حکومت، کسی چیز کی کمی نہیں۔ آدمی ہی تو ہیں۔ یہ دیکھ کر حسد کرنے لگے۔ دل میں رشک پیدا ہوگیا تو کیا ہوگا اور رشک وحسد جانتی ہو انسان کے لیے کیسی بلائیں ہیں؟ ایسی بے درماں بلاؤں سے اُن کی فطرت خراب ہونے دوں گا؟ ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں۔ خواہ وہ مصیبت میں مر ہی کیوں نہ جائیں۔ دوستی ہے ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ میں میر صاحب کا حقیقی دوست ہوں۔ کب گوارا کروں گا کہ وہ طمع اور حرص کے جال میں پھنسیں اور بفرضِ محال میں نے غلطی سے انھیں بلایا اور وہ حماقت سے آ بھی گئے۔ شیطان نے انھیں ورغلایا۔ ناداری، بے روزگاری اور مصیبت میں شیطان خوب کام کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ سے کچھ قرض مانگ بیٹھے۔ افلاس میں وضع داری کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں تو کیا میں انھیں قرض دے دوں گا؟ توبہ توبہ! لاحول ولاقوۃ! جو چیز میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا، دوست کے لیے کس طرح پسند کروں؟ دوستی اور چیز ہے اور قرض اور...'' (۱۷)

آسکر وائلڈ کا Miller اپنی جانب سے Hans پر احسان کرنے کے لیے اُسے ٹھیلا گاڑی کی لالچ دیتا ہے۔ اگرچہ کہانی کے اختتام تک وہ یہ ٹوٹی پھوٹی گاڑی اُس کے حوالے نہیں کرتا۔ آسکر نے Miller کی زبان سے یہ مکالمہ درج ذیل الفاظ میں ادا کروایا ہے:

"I will give you my wheelbarrow. It is not in very good repair; indeed, one side is gone, and there is something wrong with the wheel-spokes; but in spite of that I will give it to you. I know it is very generous of me, and a great many people would think me extremely foolish for parting with it, but I am not like the rest of the world.I think that generosity is the essence of friendship." (18)

ترجمہ: ''میں تمھیں اپنی ٹھیلا گاڑی دے دوں گا۔ اگرچہ وہ بہت اچھی حالت میں نہیں۔ (اُس کا) ایک حصہ ٹوٹ گیا ہے اور اگلے پہیوں میں کچھ خرابی ہے، لیکن میں تمھیں دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اسے پاس سے الگ کرنے پر سیکڑوں لوگ مجھے بالکل احمق خیال کریں گے، لیکن میں اوروں کی مانند نہیں ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ فیاضی دوستی کی جان ہوتی ہے۔'' (۱۹)

صبوحی صاحب نے ٹھیلا گاڑی کو قیمتی چاقو میں بدل دیا ہے، لیکن یہاں بھی ان کا چاقو، ٹھیلا گاڑی کی طرح

استعمال کے قابل نہیں ہے۔ انھوں نے ٹھیلا گاڑی کو چاقو کے ساتھ بدلنے کے باوجود وہی جزئیات بیان کی ہیں، جو آسکر وائلڈ نے اپنی کہانی میں استعمال کی ہیں۔ ذیل میں اشرف صبوحی کی کہانی سے مکالمے کا وہ حصہ پیش ہے:

''میرے پاس ایک شکاری چاقو ہے، کرنل صاحب نے دیا تھا۔ وہ ولایت سے لائے تھے۔ دستہ ٹوٹ گیا ہے۔ بچوں نے پتھر مار مار کر دانتے ڈال دیے ہیں۔ چاہے دھار لگوا لینا، چاہے آری کا کام لینا۔ چیز اچھی ہو تو اس سے دو کام آسانی کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ بہر حال میں وہ تمھیں دے دوں گا۔ انعام کی چیز ہے۔ پھر کرنل صاحب کی تحفہ دی ہوئی، دینی تو نہیں چاہیے، مگر تم جیسے مخلص دوست سے کیا دریغ۔'' (۲۰)

کہانی کے اختتامیے کی جانب بڑھتے ہوئے آسکر وائلڈ کے بیانیے اور مکالمے کا سلسلہ اس طرح چلتا ہے:

"One evening little Hans was sitting by his fireside when a loud rap came at the door. It was a very wild night, and the wind was blowing and roaring round the house so terribly that at first he thought it was merely the storm. But a second rap came, and then a third, louder than any of the others.

"'It is some poor traveller,' said little Hans to himself, and he ran to the door.

"There stood the Miller with a lantern in one hand and a big stick in the other.

"'Dear little Hans,' cried the Miller, 'I am in great trouble. My little boy has fallen off a ladder and hurt himself, and I am going for the Doctor. But he lives so far away, and it is such a bad night, that it has just occurred to me that it would be much better if you went instead of me. You know I am going to give you my wheelbarrow, and so it is only fair that you should do something for me in return."

"'Certainly,' cried little Hans, 'I take it quite as a compliment your coming to me, and I will start off at once. But you must lend me your lantern, as the night is so dark that I am afraid

I might fall into the ditch."

"'I am very sorry,' answered the Miller, 'but it is my new lantern and it would be a great loss to me if anything happened to it." (21)

ترجمہ: ''ایک رات ننھا فیروز آگ تاپ رہا تھا کہ یکا یک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ یہ بلا کی مہیب رات تھی۔ اس کی جھونپڑی کے پاس آندھی اس زور وشور سے چل رہی تھی کہ پہلے اس نے محض ہوا کا ٹھوکا سمجھا، لیکن پھر آواز سنائی دی اور تیسری بار تو بہت زور کی آواز آئی۔

'ہوگا کوئی بیچارا مسافر!' ننھا فیروز دروازے کی طرف بڑھا، مگر چودھری ایک ہاتھ میں لالٹین لیے اور دوسرے میں لاٹھی تھامے کھڑا تھا۔ فیروز کی صورت دیکھتے ہی بولا: 'پیارے ننھے فیروز! میں سخت مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میرا چھوٹا لڑکا سیڑھیوں سے پھسل پڑا ہے اور سخت چوٹ آئی ہے اور آج کی رات بھی کچھ ایسی بھیانک ہے کہ خدا کی پناہ! وہ تو شکر ہے کہ راستے میں یوں ہی مجھے خیال آ گیا کہ کیوں نہ میں اپنی جگہ تمھیں بھیج دوں۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھیں اپنی ٹھیلا گاڑی دینے والا ہوں، اس لیے تمھارے لیے بھی مناسب ہے کہ اس کے بدلے میں کچھ تو تم بھی کرو۔''

ننھے فیروز نے جواب دیا: 'میں بسر و چشم تیار ہوں۔ آپ کا حکم بجالانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ لیجیے! میں ابھی جاتا ہوں۔۔۔ ہاں! مگر ساتھ لے جانے کے لیے آپ کو اپنی لالٹین دینی ہوگی، کیونکہ رات ایسی اندھیری ہے کہ مجھے خوف ہے، کسی گڑھے میں نہ گر پڑوں'۔

'چودھری نے کہا: 'مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ میری نئی لالٹین ہے، اس لیے اگر یہ راستے میں خراب ہوگئی تو میرا سخت نقصان ہوگا۔'' (۲۲)

صبوحی صاحب نے زمان و مکان کی معمولی سی تبدیلی کے بعد بیانیے اور مکالمے کو اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش ان الفاظ میں کی ہے، لیکن مفہوم وہی آسکر وائلڈ والا ہے:

''کوئی نو بجے ہوں گے کہ میر ٹوٹرو کوٹھڑی میں بیٹھے کانپ رہے ہیں۔ کواڑ کا ایک سیلا ہوا لکڑا دھواں دے رہا ہے کہ بڑے زور سے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بغلوں میں ہاتھ دیے ہوئے میر ٹوٹرو اُٹھے۔ دیکھا تو داروغہ جی۔

میر صاحب: دوست! اس سردی میں کہاں؟

داروغہ: بھئی! کچھ نہ پوچھو، بڑی مصیبت میں ہوں۔

میر صاحب: یا اللہ! خیریت تو ہے؟

داروغہ: سدو کے کبوتروں کا ستھراؤ ہو گیا۔

میر صاحب: کیا اولوں کی چھال جال کے اندر پہنچ گئی؟

داروغہ: اجی نہیں! ایک کالا بلاؤ گھس گیا ہے۔

میر صاحب: کالا بلاؤ؟

داروغہ: ہاں! تمھاری بھاوج کہتی ہیں کہ کوئی جن ہے۔ بلے کی کیا مجال کہ اتنے کبوتروں کا خون کر ڈالے۔

میر صاحب: بھئی! کہتے تو سچ ہو، پھر؟

داروغہ: جمنا کے پار سنا ہے کوئی فقیر جنی آئے ہوئے ہیں۔ اُن کو بلا لائیں تو یہ آفت ٹلے۔ اندھیری رات، سردی کی یہ شدت، دوسرے میرا گھر پر رہنا بھی ضروری ہے۔ بال بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری بجائے تم بھی تو جا سکتے ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا! دوستی آخر عاقبت میں کام آنے سے رہی۔ اس کے علاوہ میں نے کرنل صاحب والا چاقو اور پورنیہ کے بانس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ عجیب تحفوں کے مقابلے میں اتنا کام کیا حقیقت رکھتا ہے؟

میر صاحب: (باوجود سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہونے کے اکڑ کر) کیوں نہیں۔

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست

در پریشاں حالی و در ماندگی

مرنا ایک ہی بار تو ہے۔ گھڑی گھڑی تو موت آنے سے رہی۔ میں ابھی جاتا ہوں، فقیر جنی آ بھی جائیں گے؟

داروغہ: نہ آنا کیا معنی؟ میرا نام لینا۔ فقیر ہے یا بادشاہ، مقدور ہے کہ نہ آئے اور نہ آیا تو تمھاری دوستی کس کام آئے گی؟

میر صاحب: اچھا! تو اپنی قندیل مجھے دے دو۔ اندھیری رات، دور کا جانا، پھر رستے میں کیچڑ پانی۔

داروغہ: واہ صاحب واہ! نئی قندیل ہے۔ اولے پڑنے لگے، یا تم ہی کہیں گڑھے وڑھے میں جا پڑے تو چورا ہو جائے گی۔'' (۲۳)

آخر میں آسکر وائلڈ کی کہانی کا اختتامیہ ملاحظہ کیجیے:

"Cried little Hans and he took down his great fur coat, and his warm scarlet cap, and tied a muffler round his throat, and started off. The storm grew worse and worse, and the rain fell in torrents, and little Hans could not see where he

was going, or keep up with the horse. At last he lost his way, and wandered off on the moor, which was a very dangerous place, as it was full of deep holes, and there poor little Hans was drowned. His body was found the next day by some goatherds, floating in a great pool of water." (24)

ترجمہ: ''یہ کہہ کر ننھے فیروز نے اپنا کمبل اوڑھ لیا اور اس طوفان میں روانہ ہو گیا..... آندھی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی گئی۔ اتنے میں مینہ بھی اُتر آیا اور اس زور کی بارش ہونے لگی کہ آن کی آن میں ندی نالے بہنے لگے۔ بے چارہ ننھا فیروز اندھا دُھند چلا جا رہا تھا، لیکن نہیں جانتا تھا کہ کس طرف جا رہا ہے؟ اتنے میں ڈاکٹر کا گھوڑا یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ننھا فیروز راستہ بھول کر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ یہ مقام نہایت خطرناک تھا، کیونکہ یہ گڑھوں اور دلدلوں سے بھرا پڑا تھا۔ آخر غریب فیروز ایک دلدل میں پھنس گیا، جہاں سے نکلنا محال تھا۔ دوسرے دن گڈریوں نے اُس کی لاش ایک جوہڑ میں بہتی ہوئی پائی۔'' (۲۵)

صبوحی صاحب کی دلّی کا 'معروف' کردار میر ٹوٹرو اسی انجام کو پہنچتا ہے، جس انجام سے آسکر وائلڈ کا Miller دو چار ہوتا ہے۔ اشرف صبوحی کے خاکوں کے مجموعے دِلّی کی چند عجیب ہستیاں میں سے ایک 'عجیب' ہستی میر ٹوٹرو کے خاکے کا اختتامیہ درج ذیل ہے:

''میر صاحب بڑی مستعدی سے ایک پھٹا ہوا کمبل جسم سے لپیٹ اور لکڑی ہاتھ میں لے، چل پڑے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا، بوندا باندی جاری، ہوا کے سناٹے اور یہ منخنی سے آدمی اُڑے چلے جاتے ہیں۔ پہاڑ گنج سے سیدھے جامع مسجد اور جامع مسجد سے قلعے کے نیچے نیچے سیل کی کھڑکی سے اُتر، دریا پر پہنچے۔ اتنا لمبا اور اتنا کٹھن سفر، دوستی کا خبط اگر نہ ہوتا تو انسانی طاقت ہیچ تھی۔ دریا کو دیکھ کر میر ٹوٹرو کو پھریری آئی؛ ہچکچائے کہ اس سردی اور پانی میں اُتر کر پار جانا، لیکن دوستی سے کس طرح ہاتھ اُٹھاتے؟ جان جائے بلا سے، آن میں فرق نہ آئے۔ بسم اللہ مجریہا و مرسیہا کہہ کر دھم سے جمنا میں کود پڑے۔ اُن دنوں دریا آج کل جیسا نالہ نہ تھا، پوری ندی تھی۔ گھاٹ کے ایک چوکیدار نے کسی کو دریا میں کودتے، تھوڑی دور تک ہاتھ پاؤں مارتے اور پھر غوطے کھاتے ضرور دیکھا، مگر وہ کیا جانتا تھا کہ آدھی رات کے وقت میر ٹوٹرو، داروغہ جی کی دوستی کے شہید ہوں گے۔ صبح ہوئی تو شاہ بڑے کے آنے جانے والوں نے کانس میں اُلجھی ہوئی ایک لاش دیکھی۔'' (۲۶)

(۵)

درج بالا تفصیلات اس بات کی غماز ہیں کہ میر ٹوٹرو حقیقت میں آسکر وائلڈ کی تحریر The Devoted Friend کا چربہ ہے اور اس نام کی کوئی شخصیت دِلّی میں نہ تھی۔ آسکر وائلڈ کی تحریر The Devoted Friend پہلی مرتبہ

۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی، جبکہ اشرف صبوحی کے مجموعے دِلّی کی چند عجیب ہستیاں کی اوّلین اشاعت ۱۹۴۳ء میں عمل میں آئی، جس میں میر ٹوٹرو شامل ہے۔ اس وقت تک میر ٹوٹرو کو سامنے آئے ہوئے تقریباً ۷۴ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر حیرت ہے کہ ابھی تک کسی محقق اور نقاد کی توجہ اس جانب مرکوز نہیں ہوئی۔

حوالے:

۱۔ The Devoted Friend: Oscar Wilde: The Electric Book Company Ltd.London,UK: 2001:p3

۲۔ جاں نثار دوست (مترجمہ غلام عباس) مشمولہ معیاری افسانے: حفیظ جالندھری (مرتب): نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد: ۲۰۱۵ء: ص ۴۰۔

۳۔ The Devoted Friend:p 3

۴۔ معیاری افسانے: ص ۴۰۔

۵۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں: اشرف صبوحی دہلوی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی: ۲۰۱۵ء: ص ۱۰۰۔

۶۔ The Devoted Friend:p 4

۷۔ معیاری افسانے: ص ۴۱

۸۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں: ص ۱۰۱

۹۔ The Devoted Friend:p 4

۱۰۔ معیاری افسانے: ص ۴۱۔

۱۱۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں: ص ۱۰۱

۱۲۔ The Devoted Friend:p 4,5

۱۳۔ معیاری افسانے: ص ۴۱و۴۲۔

۱۴۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں: ص ۱۰۲

۱۵۔ The Devoted Friend:p 7

۱۶۔ معیاری افسانے: ص ۴۴۔

۱۷۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں: ص ۱۰۵و۱۰۶۔

۱۸۔ The Devoted Friend:p 8

۱۹۔ معیاری افسانے: ص ۴۵۔

۲۰۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں : ص۱۱۲۔

۲۱۔ The Devoted Friend:p 13

۲۲۔ معیاری افسانے :ص۵۰۔

۲۳۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں : ص۱۲۰تا۱۲۲۔

۲۴۔ The Devoted Friend: p14

۲۵۔ معیاری افسانے :ص۵۱۔

۲۶۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں : ص۱۲۲۔

رفاقت علی شاہد
ریسرچ اسکالر، گورمانی مرکزِ زبان و ادب، لمز، لاہور

اردو لغت شناسی میں رؤف پاریکھ کی خدمات

Rafaqat Ali Shahid
Gurmani Centre for Languages and literature,LUMS, Lahore.

Abstract: The present study covers the services of Dr.Rauf Parekh in the field of Lexicography. Dr.Rauf Parekh had been an editor of Urdu Dictionary Board ,Karachi. He has a deep knowledge of Lexicography and Linguistics. Dr. Rauf Parekh is an eminent scholar in the field of . He edited volumes of books about Lexiography and has authored many research based artilces about Language, Linguisctis and Lexiography. The present study has proficiently analyzed his reserach work on above dimensions of language.

(۱)

کسی بھی زبان کا ذریعۂ اظہار رسمِ خط ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر زبان کی جان اور اس کی پہچان اس کا ذخیرۂ الفاظ ہوتا ہے۔ زبان دان ہوں، یا اہلِ قلم، یا پھر عام قاری اور زبان سے اجنبی، سب کے لیے زبان کے ذخیرۂ الفاظ تک مکمل رسائی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ زبان کے عام الفاظ، تراکیب، محاورات، روزمرے، افعال وغیرہ کی جان پہچان اور ان کے صحیح استعمال پر بھی کسی کو مکمل عبور حاصل نہیں ہوتا۔ اس مشکل کے حل کے لیے ماہرینِ زبان لغات تیار کرتے ہیں۔ ان لغات کی مدد سے نہ صرف الفاظ و محاورات، تراکیب و اصطلاحات، افعال و اسماء کے کل ذخیرے سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، بلکہ ان کے معنی اور محلِ استعمال بھی وضاحت کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں لغات کی اہمیت کسی بھی زبان میں بیان کی محتاج نہیں۔

لغت نگار بھی چونکہ بندے بشر ہوتے ہیں، اس لیے ان کے کاموں میں غلطیوں کا در آنا ممکنات میں سے ہے۔ لغات میں جو نظری اور عملی غلطیاں راہ پا جاتی ہیں، ماہرینِ زبان ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یوں لغت نگاروں کی بنیادی کوششوں اور لغت کے ماہروں کی مدد سے زبان کے ذخیرۂ الفاظ کی تطہیر اور تصحیح کا کام جاری رہتا ہے۔ لغات سے استفادہ کرنے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے مضامین اور کتب سے باخبر رہیں اور انھیں پڑھتے رہیں، تا کہ صحیح الفاظ و تراکیب وغیرہ سے باخبر رہیں اور زبان لکھتے ہوئے صحیح الفاظ و تراکیب وغیرہ ہی استعمال کریں۔ مصنف جو کچھ لکھتا ہے، وہ زبان کا اظہار ہے۔ ایسے ہی قاری جو کچھ پڑھتا ہے، زبان کا ایک مخصوص معیار اور سطح۔۔۔ غیر شعوری طور پر اس کے ذہن میں قائم ہو جاتی ہے۔

اردو کی حد تک لغات کے بارے میں اور لغت نویسی کے بارے میں لکھا جانے والا لوازمہ جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ ان موضوعات پر اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بعض کتابوں اور سندی مقالات کے علاوہ بیسیوں مضامین اور مقالات بھی اس

موضوع پر تحریر ہو چکے ہیں۔ ان مضامین و مقالات کی زیادہ تعداد اردو رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہے۔ ان مضامین و مقالات اور رسائل و جرائد کے بارے میں ہر کسی کو معلوم نہیں اور ہر کس و ناکس کی رسائی بھی ان سب تک نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مشکلات ہیں، جن کے سبب اہلِ علم و ادب، قارئین اور لغت نگاری کے طلبہ ان بیش بہا مضامین و مقالات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

اردو لغت نویسی پر مضامین و مقالات لکھنے کا سلسلہ گذشتہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے جاری ہے۔ اس دوران جو بیسیوں تحریریں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں، ان سے استفادے کا آسان اور بہترین حل ان تحریروں کی یکجائی ہے۔ اردو لغت نگاری پر مضمون نویسی کی سو سالہ تاریخ میں یہ سہولت مہیا کرنے کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر ۔۔۔ پاریکھ کے ذہن میں آیا۔ انھوں نے اردو لغت نویسی پر لکھے گئے علمی و تحقیقی مقالات و مضامین کو متعدد جلدوں میں مرتب کر دیا ہے۔ اس مضمون میں ان کا تعارف اور ان کی افادی اہمیت واضح کرنے کی اپنی سی کوشش کی جائے گی۔

(۲)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحبِ نظر ادیب، باریک بین محقق و نقاد، مترجم اور سب سے بڑھ کر صاحبِ فن لغت شناس ہیں۔ وہ جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔ معروف قومی انگریزی روزنامے Dawn میں کالم نگاری بھی کرتے ہیں۔ ان کی عمومی شہرت ایک لغت شناس کے طور پر قائم ہے۔

لغات کی تحقیق و تدوین میں ان کے کارہائے نمایاں علمی و ادبی حلقوں سے داد سمیٹ چکے ہیں۔ ان کارناموں میں اوّلین اردو سلینگ لغت (۱) سب سے زیادہ اہم ہے۔ اردو میں یک لسانی، ذولسانی، سہ لسانی وغیرہ بیسیوں لغات تیار ہو چکے ہیں، لیکن اردو کا دامن عوامی بول چال میں مستعمل مخصوص الفاظ کے لغت سے خالی تھا۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اس کمی کو محسوس کیا اور اردو سلینگ کا ایک لغت تیار کیا، جو فضلی سنز، کراچی سے پہلی بار ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ یہ لغت ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ چنانچہ کچھ عرصے قبل اس کی دوسری اشاعت (مع ترامیم و اضافات) بھی کراچی سے ہوئی۔

امیر احمد امیر مینائی لکھنوی کی مایۂ ناز امیر اللغات کی تیسری جلد (۲) کی ترتیب بھی ان کے کارہائے نمایاں میں قابلِ ذکر اہمیت کی حامل ہے۔ امیر اللغات کی یہ تیسری جلد پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کی ترتیب میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی محنت اور دیدہ ریزی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

معروف اشاعتی ادارے اوکسفرڈ پریس پاکستان نے ایک اردو انگریزی ڈکشنری تیار کرائی (۳)۔ اس کے نگرانِ اعلی، یا مدیرِ اعلی کے فرائض بھی ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے انجام دیے۔ یہ لغت بھی متعدد بار شائع ہو کر علمی حلقوں سے داد وصول کر چکا ہے۔ طلبہ اور عام قارئین کے لیے انھوں نے ایک مختصر انگریزی اردو لغت بھی تیار کیا، جو اوکسفرڈ پریس پاکستان ہی سے شائع ہو رہا ہے (۴)۔

لغت شناسی میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی یہ عملی، تحقیقی وتدوینی کاوشیں لائقِ صد ستائش ہیں۔ان کی ان مساعی سے اردوخواں علماء، قارئین اور طلبہ وطالبات یکساں طور پر مستفید ہو رہے ہیں۔ان خدمات کے علاوہ ڈاکٹر رووف پاریکھ نے لغت شناسی کے موضوع پر متعدد مقالے اور مضامین بھی تحریر کیے۔ان تحریروں پر مشتمل ایک مجموعہ لغوی مباحث (۵) کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔علاوہ ازیں لغت نگاری کے موضوع پر بکھرے ہوئے بیسیوں مقالات ومضامین کو بھی انھوں نے تین جلدوں میں مرتب کر دیا ہے۔ یہ مجموعے بالترتیب اردو لغت نویسی۔تاریخ، مسائل اور مباحث ، اردو لغات۔اصول اور تنقید اور لغت نویسی اور لغات۔روایت اور تجزیہ کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں(۶)۔اس مضمون میں انھی چار مجموعوں سے سروکار رکھا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ اردو لغت شناسی میں متفرق مضامین کی تحریر، ترتیب اور مجموعوں کی صورت میں اشاعت کی جہت میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی کاوشوں کی وضاحت کی جائے اور ان کی ان کاوشوں کی قدر و قیمت طے کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۳)

لغوی مباحث وہ واحد مجموعہ مضامین ہے، جس میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے لغت شناسی سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب مجلس ترقیِ ادب، لاہور نے سفید کاغذ، مضبوط جلد بندی اور بہترین طباعت کے ساتھ شائع کی ہے۔ کتاب پر طبعِ اوّل کی تاریخ جون ۲۰۱۵ء مطابق شعبان ۱۴۳۶ھ درج ہے، لیکن کتاب اس کے دو تین ماہ بعد شائع ہوئی۔ مصنف نے کتاب کا انتساب افتخار عارف صاحب کے نام کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان کی کئی تحریروں کے محرک ہیں۔ ۱۹۹ صفحات کے اس مجموعے میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے کل نو مضامین شامل ہیں۔شروع میں مجلس ترقیِ ادب کے ناظم ڈاکٹر تحسین فراقی کا حرفے چند اور مصنف کی تقدیم بھی شامل ہے۔

کتاب کے پہلے دو مقالوں کے عنوان یہ ہیں: اردو لغت نویسی۔تاریخ، محرکات اور رجحانات ، اردو کی ابتدائی لغت نویسی اور نصاب نامے ۔ یہ دونوں مقالے اردو لغت نویسی کے تدریجی ارتقاء کی مختصر تاریخ ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ مقالہ نگار نے پہلے مقالے میں پانچ ادوار قائم کر کے اردو لغت نویسی کے ابتدائی نقوش، منظوم نصاب ناموں، اردو بہ فارسی، اردو بہ انگریزی اور اردو لغات کی عملی کوششوں کا ذکر کیا۔لغت نویسی کے بعض جدید رجحانات اور چند معروضات بھی مقالے کا حصہ ہیں۔دوسرا مقالہ تمام وکمال منظوم لغات، یا منظوم نصاب ناموں سے بحث کرتا ہے۔اس میں اردو لغات کے حوالے سے محرکات اور نصاب ناموں کے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔انھوں نے بجا طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ اردو نصاب ناموں کے اثر سے اردو لغات میں بھی عام طور پر لفظ کے معنی لکھنے کے بجائے اس کے مترادفات کے لکھنے کو کافی جانا گیا اور یہ رجحان آج بھی موجود ہے۔اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ نصاب ناموں کے علاوہ اس خرابی کی ایک اور وجہ فارسی لغات کی بے محابہ

تقلید بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ فارسی کی قدیم ترین لغات سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک لکھی جانے والی فارسی لغات میں بھی کم وبیش یہی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان میں بھی عموماً الفاظ کی تشریح کر کے معنی بیان کرنے کی بجائے ان کے مترادفات لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

آئندہ دو مضامین امیر مینائی سے متعلق ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ امیر مینائی غزل گو، نعت گو اور تذکرہ نگار کے طور پر تو معروف ہیں ہی، لیکن ان کی پہچان کا ایک مستحکم حوالہ لغت نویسی بھی ہے۔ امیر مینائی کی لغت نویسی اور اصولِ لغت نویسی میں مقالہ نگار نے امیر مینائی کی لغات کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ یہ تعداد میں چودہ (۱۴) ہیں۔ ان میں سے بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کے بعد امیر اللغات کی روشنی میں امیر مینائی کی لغت نویسی کا تفصیلی فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بعض خامیوں کے باوجود امیر اللغات انیسویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی اردو لغات میں اس بنا پر انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں لغت نویسی کے جدید رجحانات اور ضروریات کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں امیر اللغات سے متعلق دو نادر خط مع تفصیل وحواشی پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا خط علامہ شبلی نعمانی نے امیر مینائی کو لکھا اور دوسرا خط امیر مینائی نے منشی سجاد حسین لکھنوی (مدیر اودھ پنچ) کو لکھا۔

اگلے چار مضامین مختلف اردو لغات سے متعلق متفرق بحثوں پر مشتمل ہیں۔ فیلن کی اردو بہ انگریزی لغت اور اس کے چند دلچسپ اندراجات واسناد میں ایس ڈبلیو فیلن کی لغات کا مختصر تعارف کرانے کے بعد اس کے اردو انگریزی لغت A New Hindustani English Dictionary کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں مقالہ نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فارسی وعربی الفاظ ومرکبات، محاورات وضرب الامثال وغیرہ کی کمی کھٹکنے کے باوجود یہ لغت اس حوالے سے اہم تصور کیا جانا چاہیے کہ اس میں: ''بعض نادر اور دلچسپ کہاوتوں اور مرکبات کا خزانہ ہے''۔ مقامی اور طبقہ جاتی الفاظ کے شمول نے اس لغت کو اہم بنانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

قرار اللغات۔ امیر اللغات کا تکملہ؟ نامی مقالے میں قرار اللغات یعنی اردو محاورات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس لغت کے مؤلف سید تصدق حسین شاہ جہاں پوری قرار نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کا یہ لغت امیر اللغات کا تکملہ ہے۔ قرار اللغات اردو محاورات وضرب الامثال اور مرکبات کا لغت ہے۔ قرار شاہ جہاں پوری، امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ استاد کی وفات کے بعد قرار نے امیر اللغات کو مکمل کرنے کی غرض سے اپنی سی کوشش کے طور پر یہ لغت تالیف کیا۔ مقالہ نگار کا موقف ہے کہ مؤلفِ لغت نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے کہ وہ امیر اللغات کے طرز اور پائے کو نہیں پہنچ سکے۔ اس کے باوجود اس لغت میں دلچسپ محاورات وضرب الامثال اور ان کی اسناد ملتی ہیں، جو اہم ہیں۔

لغاتِ سعیدی اور اس کی چند تلمیحات واستعارات میں اوّلاً لغاتِ سعیدی اور اس کی چار اشاعتوں کا تفصیلی

تعارف کرایا گیا ہے، پھر اس میں مندرج چند اہم استعاروں اور تلمیحوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

اردو لغت (تاریخی اصول پر)۔ تعبیر و تشریح میں اردو لغت بورڈ کے قیام، اردو لغت (تاریخی اصول پر) کی تیاری و اشاعت اور اس سے متعلق دیگر مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ مقالہ نگار ڈاکٹر رؤف پاریکھ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۷ء تک اردو لغت (تاریخی اصول پر) کے مدیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ ان کی نگرانی اور ادارت میں لغت کی ۱۹ویں، ۲۰ویں اور ۲۱ویں جلد شائع ہوئی۔ وہ ادارے کی تاریخ، سرگرمیوں، وسائل اور مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اردو لغت بورڈ اور اردو لغت (تاریخی اصول پر) کی تسوید و اشاعت کی اس چشم کشا روداد سے بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس روداد سے اس قومی علمی منصوبے کی تفصیلات سے آگاہی ملتی ہے، جس میں بہت سے مخلص اور بے لوث اہلِ علم نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ محمد سلیم الرحمٰن، محمد احسن خاں اور منظور علی جیسے کتنے ہی قابلِ قدر اہلِ علم نے کتابوں کے مطالعے اور اسناد کی فراہمی میں مسلسل تعاون کیا۔ اس تعاون کا عرصہ نصف صدی سے زائد کا ہے۔ مقالہ نگار نے بجا طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس مخلصانہ تعاون کے بغیر اردو لغت کے اس عظیم منصوبے کی موجودہ صورت میں تکمیل کبھی ممکن نہ ہوتی۔

کتاب کا آخری مضمون لغت نویسی میں کورپس، کورپس لسانیات، وصفیت اور تجربیت کا کردار ہے۔ کورپس (Corpus) جدید طریقۂ کار ہے، جس میں مختلف استنادی متون یکجا کر دیے جاتے ہیں، جنھیں ضرورت کے وقت حوالے کے لیے استعمال کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ جدید دور میں کمپیوٹر کے استعمال کی وجہ سے اس طریقۂ کار میں مزید آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ چنانچہ کورپس لسانیات ایک شعبۂ علم کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ماہرینِ لسانیات میں سے بعض اس کی مدد سے لغات اور قواعد کو بہتر بنانے کے حق میں ہیں۔ اس کے برعکس کچھ اس طریقۂ کار کو غیر مناسب جانتے ہیں۔ اس مضمون میں انھیں بحثوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حوالے سے اردو لسانیات میں کورپس سے مدد لینے کے طریقۂ کار پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی ایک طویل عرصے کے بعد اردو لغت نویسی پر تحقیقی اور قابلِ قدر مقالات و مضامین کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے کی تحریریں مفید، قابلِ حوالہ اور اہم مباحث پر مبنی ہیں۔

(۴)

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اردو لغت نویسی کے موضوع پر متفرق مضامین بھی جمع کر دیے ہیں۔ ان مضامین کے اب تک تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا مجموعہ اردو لغت نویسی۔ تاریخ، مسائل اور مباحث ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں مقتدرہ قومی زبان (اب ادارہ فروغِ اردو زبان) سے اشاعت پذیر ہوا۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے تاریخ و تعارف میں ۲۳، دوسرے حصے اصول و مسائل میں چھے اور تیسرے حصے تنقیدی مباحث میں کل ۱۲ (بارہ) مقالات و مضامین شامل ہیں۔ شروع میں اس وقت مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین افتخار عارف کا پیش لفظ

اور مرتب کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

مقدمے میں مرتب نے اردو لغت نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کتاب کی ترتیب، مشمولہ مضامین اور ترتیبِ کتاب کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاں ضروری محسوس کیا، مرتب نے مضامین پر حواشی بھی لکھے ہیں۔ ان حواشی کی وجہ سے مضامین سے استفادہ کرنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ مرتب نے اپنے مقدمے میں بعض مضامین اور لغات کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے تاریخ وتعارف میں بعض لغات پر تعارفی اور اردو لغت نگاری کی تاریخ پر مضامین شامل ہیں۔ ان میں فرہنگِ حامدیہ، فرہنگِ آصفیہ، لغاتِ گجری، انکسل دوپروں کی چار زبانی اردو کی قدیم ترین لغت، ملا سید حسین طبی کی دکنی کی اوّلین لغت، سرسید کی مجوزہ اردو لغت، فارسی اردو کی قدیم ترین لغت، کثیر الفوائد اور نفائس اللغات پر تعارفی مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کی متنوع لغات کی جائزہ نگاری، یا تاریخ وروایت پر مضامین میں خلیل الرحمٰن داؤدی کا مضمون رسالۂ گل کرسٹ سے قدیم تر لغات، اردو لغات کے جائزے پر مبنی مسعود حسن رضوی ادیب، حافظ محمود شیرانی، نجیب اشرف ندوی اور مولوی عبدالحق کے مضامین قابلِ توجہ ہیں۔ اردو کے قدیم لغات، ذولسانی اردو لغات اور قدیم فارسی فرہنگوں میں اردو الفاظ کے جائزے پر سید سلیمان ندوی، ابواللیث صدیقی اور حنیف کیفی کے مضامین خاصے کی چیزیں ہیں۔ مستشرقین اور اہلِ انگلستان کی اردو لغت نویسی پر بالترتیب نذیر آزاد اور ایس کے حسینی کا ایک ایک مضمون ہے۔ سراج الدین علی خان آرزو اور اس کے لغت نوادر الالفاظ پر تفصیلی تحقیقی مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ کی کاوش ہے۔ اس مضمون کے سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فہرست مضامین میں اس مضمون کا عنوان اردو کا دوسرا قدیم لغت نگار درج ہے، جبکہ مضمون پر اس کا عنوان غرائب اللغات اور نوادر الالفاظ تحریر ہے۔ (دیکھیے: فہرست ص ۶ اور مضمون ص ۱۳۹) ۔ مرتب نے حواشی میں وضاحت کی ہے کہ یہ مضمون سید عبداللہ کی کتاب مباحث میں شامل ہے، لیکن نوادر الالفاظ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۹۲ء) کے مقدمے میں بعض تحقیقی مباحث کا اضافہ ہے۔ اس لیے اسی مقدمے کو بطور مضمون کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس حصے کا آخری مضمون خود مرتب کا زادۂ فکر ہے۔ اردو کی ابتدائی لغت نویسی اور نصاب نامے کے عنوان سے یہ مضمون بعد میں مرتب ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے مجموعۂ مضامین لغوی مباحث میں بھی شامل ہوا۔ کتاب کے دوسرے حصے اصول ومسائل کے چھے مضامین کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس حصے کے پہلے دو مضامین اردو لغت نویسی کے بعض مسائل اور اردو لغت نگاری کے مسائل بالترتیب مسعود حسین خان اور نذیر احمد کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان دونوں مضامین میں اردو لغت نگاری کے ضمن میں پیش آنے والے مسائل پر ماہرانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اگلے تین مضامین ایک طرح سے اردو لغت نگاری کے قواعد اور اصولوں کی وضاحت میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں اطرافِ لغت (از سید قدرت نقوی) اس موضوع پر اہم

اور معروف مضمون ہے۔ لغت نویسی اور لغت نگاری کے عنوانات سے بالترتیب سید حسن اور سہیل بخاری کے مضامین بھی اہم ہیں۔ آخری مضمون معیاری اردو لغت۔ایک خاکہ (از محمد ذاکر) اردو لغات کی معیار بندی کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔

کتاب کا تیسرا اور آخری حصہ تنقیدی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں وہ مضامین شامل کیے گئے ہیں، جن میں اردو کے مختلف لغات پر ماہرانہ نظر ڈال کر ان کے اندراجات کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ یوں کچھ خوبیوں کے ساتھ ان مضامین میں متعلقہ لغات کی بہت سی خرابیاں، یا غلطیاں بھی واضح ہوگئی ہیں۔ یہ مضامین بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ یوں کہ ان میں جن غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے، اہلِ علم، قارئین اور طلبہ و طالبات، یعنی ان لغات سے مستفید ہونے والے ان غلطیوں سے آگاہ ہو جائیں گے۔ نتیجے کے طور پر وہ ان لغات سے زیادہ بہتر طور تر استفادہ کر سکتے ہیں۔

اس حصے میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے انگریزی اردو لغت، فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات، فرہنگِ اثر، سرمایۂ زبانِ اردو (از ضامن علی جلال لکھنوی)، محاوراتِ داغ (از ولی احمد خان)، غیاث اللغات، فرہنگِ عامرہ، رسالۂ عبدالواسع، فرہنگِ تلفظ اور اردو لغت بورڈ کراچی کا اردو لغت (تاریخی اصول پر) کے تنقیدی جائزوں پر مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے نور اللغات پر پانچ، اردو لغت (تاریخی اصول پر) کے تین اور فرہنگِ تلفظ پر دو جائزے شاملِ کتاب ہیں۔ آخر میں مسعود ہاشمی کا ایک مختصر مضمون اردو لغات کا تنقیدی جائزہ ہے، جس میں فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، فیروز اللغات اور مہذب اللغات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے کے تجزیاتی و تنقیدی مضامین کے لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری، رشید حسن خاں، شمس الرحمٰن فاروقی، شان الحق حقی، عبدالرشید، طاہر محسن کاکوروی، حامد حسن قادری اور غلام عباس شامل ہیں۔

یہ کتاب اردو لغت نویسی پر مضامین کا پہلا باقاعدہ انتخاب ہے۔ اس وجہ سے اس میں صفِ اوّل کے ماہرینِ زبان و لغت کے اہم مضامین جمع ہو گئے ہیں۔ مرتب نے انھیں بڑی سلیقہ مندی سے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ان مضامین کی درجہ بندی کر لی ہے۔ مرتب نے اپنے مقدمے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

"اصولِ لغت نویسی پر بھی اردو میں تفصیلی کام کی ضرورت ہے۔" (ص ۱۷)

اُمید کرنی چاہیے کہ پیشِ نظر کتاب کے مباحث اس جانب پیش رفت کرنے میں کردار ادا کریں گے۔

(۵)

اردو لغت نگاری اور لغات پر بکھرے ہوئے متفرق مضامین کی جمع و ترتیب پر مشتمل ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا مرتبہ دوسرا مجموعہ اردو لغات۔اصول اور تنقید ہے۔ یہ مجموعہ فضلی سنز، کراچی سے ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۳۰۳ صفحے ہے۔ کتاب میں کل ۱۴ مضامین و مقالات شامل ہیں۔ انھیں مرتب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ اصولِ لغت کا ہے۔ اس حصے میں کل پانچ مضامین شامل ہیں۔ دوسرے حصے تنقیدِ لغت میں نو مضامین و مقالات ہیں۔ کتاب کے شروع

میں فہرست کے بعد ایک صفحے میں مرتب ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی تصنیف ،تالیف، ترتیب، تدوین، ترجمہ شدہ کتابوں کی فہرست اور دو صفحوں میں کتاب کا مقدمہ ہے۔

پہلے حصے اصولِ لغت میں گیان چند جین ،حامد حسین ندوی، سید خواجہ حسینی، علی جواد زیدی اور مرتب کتاب کے مقالات و مضامین شامل ہیں۔ ان میں پہلے دو فاضلین کی تحریریں اصولِ لغت سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیسرا مضمون اردو لغت نویسی کے مسائل اور آئندہ اردو لغت کی جدید تدوین سے متعلق ہے۔ مرتب کا مقالہ امیر مینائی کی لغت نویسی اور اصولِ لغت نویسی پر ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر اس مضمون کے تیسرے حصے میں آچکا ہے۔

گیان چند جین کی ایک شہرت علمِ لسانیات کے ماہر کی ہے۔ ان کا مقالہ علم اللغات اور لفظ اصلیات کا تعلق بھی لسانیات ہی سے ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں اردو لغت نویسی کے بعض مسائل واضح کیے ہیں۔ حامد حسین ندوی کا مضمون لغت (Dictionary) ان کی کتاب لکھنؤ کی لسانی اور ادبی خدمات سے لیا گیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں لغت کی عام تعریف کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی لغت نویسی کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

دوسرے حصے تنقیدِ لغت میں مختلف اردو لغات کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعے پر مشتمل مضامین و مقالات شامل ہیں۔ اس حصے میں پہلا مضمون مشفق خواجہ کا ہے، جو انھوں نے نمونۂ لغاتِ اردو کے جائزے پر تحریر کیا ہے۔ نمونۂ لغاتِ اردو اصل میں ترقی اردو بورڈ (اب اردو لغت بورڈ)، کراچی کی جانب سے شائع کیے جانے والے ان کراسوں کا نام ہے، جو اردو لغت (تاریخی اصول پر) کی اشاعت سے قبل قسط وار شائع کیے جاتے رہے۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ ماہرینِ زبان وادب اور لغت شناس ان نمونوں کا جائزہ لے کر ان کی خامیاں نشان زد کریں، تاکہ لغت کا کام بہتر انداز میں ہو سکے اور مجوزہ لغت میں کم سے کم غلطیاں ہوں۔

اگلی دو تحریریں امیر مینائی کی لغت نویسی سے متعلق ہیں۔ ان میں سے پہلا مقالہ ابو محمد سحر کی کتاب مطالعۂ امیر (لکھنؤ ،۱۹۶۵ء) سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد تین مضامین میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی لغت نویسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان میں سے دو مضامین جابر علی سید اور سید قدرت نقوی کے زادۂ فکر ہیں، جبکہ تیسرا مقالہ شہاب الدین ثاقب کی کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ماخوذ ہے۔ جابر علی سید نے مولوی عبدالحق کی لغت نگاری کے تسامحات کو موضوعِ بحث بنایا ہے، جبکہ بقیہ دونوں فاضلین کی تحریریں بابائے اردو کی لغت نگاری کے نمایاں رجحانات کو اُجاگر کرتی ہیں۔

یہ مقالہ مہذب اللغات کی قسط وار اشاعت سے پہلے کراسے، یعنی پہلی قسط کے جائزے پر لکھا گیا ہے۔ مہذب اللغات کی جلد اوّل کی یہ پہلی قسط ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی اور اسی سال اس پر زیرِ نظر تحریر لکھی گئی اور شائع ہوئی۔ اس پر مصنف کے طور پر 'ایک واقف کار' کا نام لکھا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی شہرت اور تعارف کے کئی حوالے ہیں۔ان کی غالب شناخت ایک زیرک نقاد کی ہے۔وہ داستان شناس، میر وغالب واقبال شناس، ناول نگار، افسانہ نگار، لغت نگار اور ادبی جریدے کے مدیر کے طور پر بھی اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ لغاتِ روزمرہ کے عنوان سے انھوں نے ایک لغت بھی مرتب کیا ہے۔اس میں ان غریب اور نادر الفاظ کو جمع کیا گیا ہے، جو اردو کے پرانے متون میں تو ملتے ہیں، لیکن آج کے لغت نگار انھیں بھول چکے ہیں۔ لغاتِ روزمرہ اب تک متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔اس کا تفصیلی جائزہ عبدالرشید نے لیا ہے۔کتاب کے آخری دو میں سے پہلا مقالہ یہی ہے۔ عبدالرشید موجودہ دور کے باریک بیں لغت شناس اور کلاسیکی اردو ادب کے شناور ہیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں استاد ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی سے گہرا ربط بھی رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنے مقالے میں بعض الفاظ کے استعمال، ان کی پیش کردہ سندوں اور دیگر متعلقہ موضوعات پر شمس الرحمٰن فاروقی سے اختلاف کیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی، فاروقی صاحب کے تسامحات کی نشاندہی علمی انداز میں کی ہے۔اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے عبدالرشید کے اس مضمون کی تعریف کی ہے۔اس مضمون میں نشان زد تسامحات دور کر کے لغاتِ روزمرہ کا نیا مسودہ تیار کیا، جو بعد میں 'ترمیم ونظرِ ثانی شدہ' ہو کر شائع ہوا۔اس کے مقدمے میں فاروقی صاحب نے عبدالرشید کی محنت کی داد دی اور غلطیوں کی نشاندہی پر ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

کتاب کا آخری مضمون بھی عبدالرشید کا تحریر کردہ ہے۔ متن اساس فرہنگیں۔مسائل اور صورتِ حال میں ان لغات پر بات ہوئی ہے، جو متون کے ساتھ کتاب میں شامل ہوتے ہیں۔ان میں سے بیش تر فرہنگیں ہوتی ہیں اور متن کے ساتھ ہی کتاب میں شامل کر لی جاتی ہیں۔کچھ فرہنگیں لغات کی صورت علاحدہ تالیف کی جاتی ہیں۔ان کی بنیاد بھی کلاسیکی متون ہیں۔مضمون میں ایسی فرہنگوں پر تعارفی کلمات کے بعد ان کی ایک فہرست پیش کی گئی ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کی اردو مثنوی کی فرہنگ کا مختصر تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔اس تجزیے میں کچھ ایسے الفاظ مع اسناد درج کیے گئے ہیں جو اردو مثنوی کی فرہنگ سے غیر حاضر ہیں، جبکہ انھیں اس فرہنگ میں ہونا چاہیے تھا۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کتاب بھی اردو لغت نویسی پر اہم اور وقیع مضامین کی حامل ہے۔کتاب میں شامل مقالات و مضامین، ان کی ترتیب وپیشکش اور حواشی کے اضافے سے مرتب کی سلیقہ مندی اور شغفِ علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔فضلی سنز، کراچی نے کتاب کی طباعت واشاعت میں نفاست اور معیار کا خاص خیال رکھا ہے۔پہلی کتاب کی طرح یہ کتاب بھی اردو لغت نویسی کے موضوع پر حوالہ جاتی، معلوماتی اور گراں مایہ مقالات ومضامین سے ثمر بار ہے۔

(۶)

مذکورہ سلسلے کی تیسری اور اب تک کی آخری کتاب لغت نویسی اور لغات۔روایت اور تجزیہ ہے۔اسے بھی فضلی

سنز، کراچی نے شائع کیا۔ یہ کتاب ۲۰۱۵ء کے شروع میں شائع ہوئی۔ ۳۴۳ صفحات کی ضخامت کی یہ کتاب بھی فضلی سنز کی ماہرانہ طباعت وپیشکش کا معیاری نمونہ ہے۔ اس کتاب میں کل ۲۵ مضامین شامل ہیں، جنھیں چار عنوانات، یا موضوعات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ ان موضوعات کے نام یہ ہیں: لغت نویسی، لغات، لغت نویس، لغت ساز ادارے۔ کتاب کے شروع میں فہرست کے بعد مرتب کی تقدیم ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کا تعلق اردو لغت نویسی کے اصولوں اور مسئلوں سے ہے۔ پہلا مضمون ارشد مسعود ہاشمی کا لغت اور لغت نویسی ہے۔ اس مضمون میں ایک شعبۂ علم کے طور پر لغت کی تعریف اور لغت نویسی سے متعلق مختلف اصولوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد محمد ضیاء الدین انصاری کا مقالہ اردو فرہنگ نویسی کا تحقیقی جائزہ ہے۔ اس مقالے میں اردو میں فرہنگ نویسی کی روایت کے تاریخی ارتقاء پر نظر ڈالی گئی ہے اور معروف فرہنگوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے املا کے اختلاف اور لغت کے موضوع پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے اور اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ حفیظ الرحمٰن واصف نے لغات کی تحقیق میں بعض الفاظ کے معنی متعین کرنے کے سلسلے میں مختلف اسناد اور اقوال سے بحث کی ہے۔ شعبۂ اردو جامعہ پنجاب کے پروفیسر فخر الحق نوری نے جاپان میں اردو۔ لغت نویسی کے تناظر میں لکھ کر جاپان میں اردو لغت نویسی کی روایت پر مختصراً روشنی ڈالی ہے اور اردو جاپانی فرہنگ کا تعارف کرایا ہے۔

دوسرے حصے لغات میں مختلف اردو اور اردو زبان ولسانی لغات کے تجزیاتی مطالعے پر دس مضامین شامل ہیں۔ پہلے دو مضامین اردو فارسی لغات سے متعلق ہیں اور اردو کے دو بڑے اور معتبر فاضلین کے قلم سے ہیں۔ شبلی نعمانی نے لغتِ فرس از اسدی طوسی پر اور قاضی عبدالودود نے مجمع الفرس پر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں مولانا شبلی کا مضمون تبصراتی اور قاضی صاحب کا تنقیدی ہے۔ آغا افتخار حسین کا کرنل سر ہنری یول کی اردو فرہنگ ہابسن جابسن پر تعارفی وتنقیدی مضمون ہے۔ سخاوت مرزا کے مضمون تحقیقاتِ الفاظ ہندی غرائب اللغات میں ان مقامی، یا ہندی الاصل الفاظ کا جائزہ لیا گیا ہے، جو معروف ہندوستانی فارسی لغت غرائب اللغات میں آئے ہیں۔ نور اللغات کا تقابلی مطالعہ میں سید خواجہ حسینی نے معروف اردو لغت نور اللغات کے اندراجات کا امیر اللغات اور فرہنگِ آصفیہ سے موازنہ کیا ہے۔ عبداللہ چغتائی کے مضمون تدوین وطباعت انگریزی اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادارت میں تیار ہونے والی انجمن ترقیِ اردو کی انگریزی اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری کی تیاری وطباعت کی روداد بیان کی گئی ہے۔

جلال لکھنوی کی حیثیت تین جہتوں سے اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام کی حامل ہے۔ وہ کلاسیکی طرز کے اچھے غزل گو تھے۔ ماہر داستان گو، داستان نگار اور لغت نویس تھے۔ محمد حسن نے ان کی حیات وخدمات پر ڈاکٹریٹ کا سندی مقالہ لکھا تھا، جو نصف صدی سے زیادہ عرصے قبل کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں سے جلال لکھنوی کی لغت نویسی کا حصہ مضمون

کی صورت میں پیشِ نظر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں محمد حسن نے جلال کے لغات سرمایۂ زبانِ اردو پر قدرے تفصیل سے اور تنقیح اللغات پر اختصار کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ تنقیح اللغات کے سلسلے میں بحث عموماً اس کے جلال لکھنوی سے انتساب اور اس کی عدم دستیابی پر رہی ہے۔

نیاز علی بیگ نکہت دہلوی بھی انیسویں صدی میں اردو کے ایک غیر معروف غزل گو اور معروف مثنوی نگار ہیں۔ انھوں نے اردو محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی مخزنِ فوائد کے نام سے لکھی، جو ۱۸۴۵ء میں شائع ہو کر کمیاب ہوگئی۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے محقق نے مخزنِ فوائد کے تعارف، تجزیے اور اس کے مؤلف کی حیات پر مشتمل ایک مقدمہ تحریر کیا۔ یہی مقدمہ مرتب نے پیشِ نظر کتاب میں مقالے کے طور پر شامل کیا ہے۔

محمد عالم مختار حق مرحوم نے ایک مراسلے کے ذریعے نفائس اللغات پر ایک مطبوعہ مضمون کے چند تسامحات کی نشاندہی کی ہے۔ دوسرے حصے کا آخری اور اہم تر مقالہ عبدالرشید کا چند معروضات۔ شعرِ شور انگیز کے تعلق سے ہے۔ یہ لکھنے کی احتیاج نہیں کہ شعرِ شور انگیز شمس الرحمٰن فاروقی کا زریں کارنامہ ہے۔ اس میں جہاں جہاں انھوں نے اشعارِ میر کی تفہیم کے نکات واضح کیے ہیں، وہاں اور بحثوں کے ساتھ بہت سے لغات بھی درج کیے ہیں۔ ان میں سے بعض لغات کے معنی و مفہوم میں عبدالرشید کو اتفاق نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس مقالے میں ایسے کچھ لغات / الفاظ کے معنوں کے سلسلے میں اپنا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ لغت نویسوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس حصے میں مولوی سید احمد دہلوی (مؤلف فرہنگِ آصفیہ) پر سید یوسف بخاری دہلوی اور رشید حسن خاں کے مضامین ہیں، جبکہ ایس ڈبلیو فیلن پر محمد اکرام چغتائی کا مضمون فیلن اور اس کے کارنامے۔ ایک تعارف شامل ہے۔

کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ لغت ساز ادارے ہے۔ اس میں پہلا مقالہ دفتر امیر اللغات پر سید جاوید اقبال کا ہے۔ سید جاوید اقبال سندھ یونیورسٹی، جامشورو میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ انھوں نے امیر مینائی کے خطوط پر ڈاکٹریٹ کا سندی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ہے۔ اپنے اس مقالے میں انھوں نے امیر مینائی کی لغت نویسی کو بھی مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔ دفتر امیر اللغات میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ امیر اللغات کی تالیف کی تسوید میں اس دفتر کی کارروائیوں کا کردار واضح کیا ہے۔ شواہد اور تحقیق کے ذریعے انھوں نے بعض فاضلین کے بیانات کی تصحیح بھی کی ہے۔ یہ اس کتاب کا ایک اور اہم تر مقالہ ہے۔

حکومتِ ہند کے مرکزی ادارے ترقیِ اردو بورڈ (اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان) نے اردو کے ایک جامع لغت کی تیاری کا منصوبہ بنایا اور اس کا ایک نمونہ تیار کر کے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ اس پر ڈاکٹر محمود الٰہی نے تنقیدی مضمون لکھ کر کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نذیر احمد اور ان کے جواب الجواب میں محمود الٰہی اور صابر سنبھلی نے مضامین لکھ

کرچھپوائے۔ کتاب کے اگلے چار مضامین یہی ہیں۔ کتاب کے آخری دو مضامین کا تعلق اردو لغت (تاریخی اصول پر) سے ہے۔ ان میں سے ایک مضمون تو مرتب کتاب ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا ہے، جس کا تفصیلی ذکر اس مضمون کے تیسرے حصے میں آچکا ہے۔ دوسرا مضمون مرزا نسیم بیگ کا اردو ڈکشنری بورڈ۔ ایک جائزہ ہے۔ اس میں ادارے کی تاسیس و تاریخ اور سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بحیثیتِ مجموعی اس کتاب میں بھی اردو لغت نویسی اور اس کے متعلقہ موضوعات پر اہم تحریریں جمع ہوگئی ہیں۔ ان تحریروں میں سے پیشتر تعارفی نوعیت کے مضامین ہیں۔ کچھ اہم تر مقالے بھی اس کا حصہ ہیں۔ یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کوئی تحریر بے فائدہ نہیں۔

(۷)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی درج بالا تصنیف و مرتبات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے نہایت اہم اور قابلِ قدر لغت شناس ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں مجموعوں میں شامل مقالات و مضامین کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ ان میں سے خاصے مضامین ایک عرصے سے بکھرے ہوئے تھے۔ کسی کو ان گوہر ریزوں کو جمع کر کے کنارِ دامنِ ادب کو مزین کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ لائقِ صد مبارک ہیں کہ ان کی اس مساعی سے دامنِ ادب میں چند گوہر ہائے آبدار کا اضافہ تو ہوا ہی ہے، علمی و تحقیقی تحریروں کے تشنگان کو اپنی پیاس بجھانے کا ایک ذریعہ بھی ہاتھ آ گیا ہے۔

حوالے:

(۱) اوّلین اردو سلینگ لغت دو بار چھپ چکی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں فضلی سنز، کراچی کے زیر اہتمام اشاعت آشنا ہوا۔ دوسری بار یہ لغت ۲۰۱۵ء میں چھپا۔

(۲) امیر اللغات، جلد سوم: ڈاکٹر رؤف پاریکھ (مرتب): پنجاب یونیورسٹی، لاہور: ۲۰۱۰ء۔

(۳) اردو انگریزی ڈکشنری: ڈاکٹر رؤف پاریکھ (مدیر اعلیٰ): اوکسفرڈ پریس پاکستان، کراچی: پہلی بار ۲۰۱۳ء۔

(۴) ایک مختصر انگریزی اردو لغت: اوکسفرڈ پریس پاکستان، کراچی: پہلی اشاعت ۲۰۰۹ء۔

(۵) لغوی مباحث: ڈاکٹر رؤف پاریکھ: مجلس ترقیِ ادب، لاہور طبعِ اول جون ۲۰۱۵ء۔

(۶) اردو لغت نویسی۔ تاریخ، مسائل اور مباحث: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۲۰۱۰ء۔

اردو لغات۔ اصول اور تنقید: فضلی سنز، کراچی: ۲۰۱۴ء۔

لغت نویسی اور لغات۔ روایت اور تجزیہ: فضلی سنز، کراچی: ۲۰۱۵ء۔

نورینہ تحریم بابر
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو میں ارضِ پاکستان کی تاریخ نگاری۔ ایک توضیحی مطالعہ

Noreena Tehreem Babar
Associate Professor, department of Urdu, AIOU, Islamabad.

Abstract: This article is a detailed discussion on Rasheed Akhtar Nadvi's book Arz e Pakistan ki Tareekh which covers the pre and post incidents of Alexendar. This essay not only highlights the different aspects of this worthy historical book but also talks about the obstacles faced in the completion and publication of this volume. The researcher has worked aptly on critical appreciation of this historic book.

ایک مؤرخ کے طور پر رشید اختر ندوی کی توجہ اور علمی دلچسپی کا محور صرف اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ہی نہیں رہی، بلکہ وہ ارضِ پاکستان کی تاریخ کے نہایت باریک بین، نکتہ رس اور صاحبِ بصیرت مؤرخ کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد برِ صغیر کے ان علاقوں کی تاریخ اور جغرافیے کو از سرِ نو موضوعِ تحقیق بنانے کی شعوری کوشش شروع ہوئی، جن میں نو آزاد ملک قائم ہوا تھا۔

رشید اختر ندوی ندوۃ العلماء کے طالب علم اور جامعہ ملیہ، دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ رشید اختر کا ہمیشہ کے لیے 'ندوی' ہو جانا ان کے رجحانِ طبع اور علمی مذاق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برِ صغیر کے علمی مراکز کی اپنی اپنی اہمیت اور فضیلت رہی ہے۔ ندوہ: علمائے قدیم اور علی گڑھ کی دو انتہاؤں کے درمیان ایک وسط کا درجہ تو بالآخر حاصل نہ کر سکا، لیکن شبلی کے ذریعے علی گڑھ سے اور مصر سے فیض اُٹھانے والے ندوہ (۱) نے ایسے علماء ضرور پیدا کیے اور ایسا مذاقِ علمی ترتیب دیا، جس نے بہر صورت قوم کی ضروریات کو کسی قدر پورا کرنے کی کوشش کی۔ جس طرح ندوہ سید سلمان ندوی، مولانا عبد السلام، سید نجیب اشرف اور مولوی ابو ظفر (۲) ایسے عظیم المرتبت علماء پر فخر کر سکتا ہے تو یقینی طور پر رشید اختر ندوی بھی ندوہ کے تفاخر میں اضافہ کرنے والوں کی صف میں شامل کیے جانے کے قابل ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ پر تاریخی، تہذیبی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حوالوں سے گہری نظر ڈالی اور بنیادی حوالوں سے تاریخ کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شبلی نعمانی بنے یا نہ بنے، وہ یقینی طور پر شبلی کے راستے پر ضرور چلے۔

رشید اختر ندوی کو اسلامی تاریخ مرتب کرتے ہوئے قریباً بیس برس کے قریب ہو چکے تھے۔ اسلامی تاریخ پر ان کے تین بڑے وقیع منصوبے شائع ہو کر توجہ حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک، تاج کمپنی کے زیرِ اہتمام انھوں نے طلوعِ اسلام کے زیرِ عنوان چار جلدوں میں مسلمانوں کی تاریخ مرتب کی۔ یہی تاریخ بعد ازاں ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں

دو جلدوں کی صورت میں تاریخ اسلام کے زیرِ عنوان شائع ہوئی۔ اسی طرح انھوں نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے زیر اہتمام تہذیب وتمدنِ اسلامی تین جلدوں میں مکمل کی۔ یہ منصوبہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک مکمل ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں مسلمان حکمران کے زیرِ عنوان مسلمان تاجداروں کی ایک دلچسپ ترتیب اور توضیح سامنے آئی تو تاریخ نگاری کا یہ پس منظر تھا، جس میں رشید اختر ندوی نے تاریخ کے ایک مختلف دائرے میں تحقیق کرنے کا سوچا۔ اب کی بار ان کا دائرۂ تحقیق ملک کا مغربی حصہ تھا۔ یہ حصہ اُس دور میں مغربی پاکستان کہلاتا تھا۔ اس دور کے بارے میں ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

''جب ایوب خان برسرِ اقتدار آگئے تو انھوں نے پاکستان کے مؤرخوں کی ایک میٹنگ طلب کی اور اس میں اس خیال کا اظہار کیا کہ اس خطے کی تاریخ کہ جس کا نام اب پاکستان ہے، اس کے قدیم تمدن کے بارے میں تحقیق ہونی چاہیے۔'' (۳)

اگر ایوب خان اجلاس بلا کر ہدایت نہ بھی دیتے تو بھی ان علاقوں کی تاریخ اور تمدن کو توجہ اور تحقیق کا مرکز بنانا وقت کی اہم ترین ضرورت تھی کہ جن پر پاکستان قائم ہوا تھا۔

مغربی پاکستان کی تاریخ ۔ جلد اوّل:

رشید اختر ندوی نے مرکزی اُردو بورڈ کے تعاون اور اشتراک سے پاکستان کی ایک مفصل، منظم اور مرتب تاریخ لکھنے کا منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ کم از کم سات جلدوں میں مکمل ہونا تھا۔ پہلی جلد کا عنوان مغربی پاکستان کی تاریخ ۔ جلد اوّل قرار پایا۔ یہ ون یونٹ کا دور تھا اور پاکستان مغربی اور مشرقی حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک سرکاری ادارے کی طرف سے صرف مغربی پاکستان کی تاریخ کا منصوبہ شروع کرنے کی بجائے اگر مغربی اور مشرقی دونوں حصوں کی تاریخ پر مشتمل تاریخ بعنوان 'پاکستان کی تاریخ' مرتب کروانے کا اہتمام کیا جاتا تو زیادہ موزوں اور مفید بات تھی، لیکن وہ دور جب یہ علمی منصوبہ ایک سرکاری ادارے مرکزی اُردو بورڈ لاہور کے زیرِ اہتمام منظور ہوا، پاکستان کے پہلے فوجی آمر ایوب خان کا دورِ حکومت تھا۔ اس دور میں محسوس اور غیر محسوس طور پر ایسے متعدد اقدامات کیے گئے، جن میں پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصوں کے مابین فرق وامتیاز کو روا رکھا گیا۔ زیادہ توجہ کا مرکز مغربی پاکستان کو بنایا گیا۔ مرکزی اُردو بورڈ لاہور کے اس دور میں ڈائریکٹر احمد الدین اظہر تھے۔ ان کے دور میں رشید اختر ندوی کا یہ علمی منصوبہ نہ صرف منظور ہوا، بلکہ مغربی پاکستان کی تاریخ کے زیرِ عنوان اس منصوبے کی پہلی جلد پہلی بار نومبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس تاریخ کے پہلے صفحے پر یہ اطلاع بھی درج ہے کہ:

''یہ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ باقی جلدیں لکھی جاچکی ہیں اور علی الترتیب چھپ رہی ہیں۔'' (۴)

اس مختصر سی اطلاع میں جن جلدوں کی علی الترتیب اشاعت کی خبر دی گئی تھی، امر واقعہ یہ ہے ان متعدد جلدوں کی اشاعت کی نوبت بوجوہ کبھی نہ آسکی۔ مغربی پاکستان کی تاریخ ۔ جلد اوّل نومبر ۱۹۶۵ء کو شائع ہوئی۔ کتاب پر ایک طویل انتساب بھی درج ہے:

"میں اپنی اس ناچیز تالیف کو، جو مغربی پاکستان کے پانچ ہزار سالہ ماضی کی روداد ہے، عالی قدر صدرِ مملکت پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی حد درجہ اعلیٰ قیادت و رہنمائی میں لڑنے والی بری، بحری اور فضائی افواج کے ایک ایک سپاہی کے نام معنون کرتا ہوں۔ ان کے نام بھی جو خدا کے فضل و کرم اور اپنی عزیمت و استقلال اور جرأت و بہادری کے سبب ہندوستان کے انتہائی شدید حملے کے باوجود اس وقت تک زندہ و سلامت ہیں اور ان کے نام بھی، جو دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنے گرامی و عزیز وطن پر قربان ہو گئے ہیں اور شہادت کا درجۂ بلند پا لیا ہے۔" (۵)

اس انتساب کے نیچے مؤلف کے نام کے ساتھ ۲ رنومبر ۱۹۶۵ء کی تاریخ درج ہے۔ گویا یہ کتاب ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے قریباً ایک ماہ بعد شائع ہوئی۔ اس تناظر میں مندرجہ بالا انتساب کی وجہ اور ضرورت سمجھ میں آسکتی ہے اور پھر یہ اشاعت ایک سرکاری ادارے کے تحت ہو رہی تھی۔ ممکن ہے اس دور میں سرکاری اداروں کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی کتب میں حکمرانِ وقت کی توصیف و عظمت کا بیان لازم خیال کیا جاتا ہو۔

مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد اوّل کے حرفِ آغاز میں فاضل مؤلف، معروف مؤرخین اور محققین کے اس تأثر کی تردید کرتے ہیں کہ اس خطۂ ارضی کی تاریخ سکندر مقدونی کے حملے سے پہلے نامعلوم کی ذیل میں آتی ہے اور کسی واقعے اور اس کے وقوع کے بارے میں حتمی زمانی تعین ممکن نظر نہیں آتا۔ اس ضمن میں رشید اختر ندوی مشہور مؤرخ ایلفنسٹن (ہسٹری آف انڈیا) اور ونسنٹ سمتھ (ارلی ہسٹری آف انڈیا) کے بیانات کا حوالہ دیتے ہیں۔ رشید اختر ندوی کا استدلال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل تک اس خطۂ ارضی کے بارے میں جو نئی تفصیلات اور انکشافات ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی وساطت سے سامنے آئے ہیں، ان کی روشنی میں اس خطۂ ارضی کی قدیم تاریخ اور زمانی تعین ممکن ہو گیا ہے۔ رشید اختر ندوی اس ضمن میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی ان تھک کوششوں کا برملا اعتراف کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ ان عجیب و غریب حقائق کے بے نقاب ہونے کے بعد اب پاکستان کی تاریخ سکندر مقدونی کے حملے سے تین ہزار سال قبل تک پتھروں کی ایسی ٹھوس حقیقت کی شکل اختیار کر گئی ہے کہ ماضی بعید کے بارے میں بھی اب بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ (۶)

اس ضمن میں فاضل مؤلف وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"...... مثلاً: اب یہ دعویٰ قیاس و امکانی حدود میں محدود نہیں رہا اور یقینی صورت اختیار کر گیا ہے کہ وادیِ سندھ، وادی ژوب، موہن جوڈیرو اور ہڑپہ کی تہذیب تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب ہے اور یہ کسی لحاظ سے بھی اس دور کی عصری اور بابلی تہذیب و ثقافت سے ہیٹی نہیں ہے۔ بلاشبہ ۱۹۲۸ء سے پہلے یہ بات اتنے وثوق و اعتماد سے نہیں کہی جا سکتی تھی، کیونکہ اس وقت تک سندھ کے کنارے پر آباد موہن جوڈیرو اور وادی کا راز دار ہڑپہ، اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں آئے تھے۔ نہ امری نل،

نہ کلی، نہ شاہی ٹمپ، نہ سنگکن ڈور، نہ دابر کوٹ اور نہ وادیِ ژوب کے بارے میں ہمیں مکمل آگاہی ہوئی تھی اور نہ درۂ بولان کے ماحول کی ڈھیریاں پروفیسر سٹورٹ پگٹ جیسے جی دار محقق نے کھودی تھیں۔

اس باب میں مغربی پاکستان کا ہر مؤرخ سرجان مارشل، سر اورل سٹین، مسٹر واٹس، مسٹر ارنسٹ میکے، پروفیسر سٹورٹ اور مسٹر بینرجی اور دوسرے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا بے حد ممنونِ احسان ہے، جنھوں نے وادیِ سندھ کی تہذیب اور اس حصۂ ملک میں دوسری تہذیبوں کی عمر متعین کرنے کے لیے بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سوات و مردان میں کھدائی کی اور اپنے عمیق مشاہدہ اور قدیم تہذیبی معلومات و تجربات کی بنا پر کھدائیوں سے برآمد ہونے والے آثارِ قدیمہ کی عمریں متعین کیں۔'' (۷)

مغربی پاکستان کی اس مفصل تاریخ کی ثروت خیزی، معنویت اور قدامت کو اور اس خطۂ ارض میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں کے نتیجے میں سامنے آنے والے انکشافات کو رشید اختر ندوی نے اپنا بنیادی ماخذ بنایا ہے۔ وہ اس خطۂ ارض کے قدیم ادوار کے سیاحوں کے اندراجات کو بھی سامنے رکھتے ہیں، لیکن اساسی طور پر رشید اختر ندوی نہ تو ماہرِ آثارِ قدیمہ ہیں اور نہ ہی انھوں نے ارضی تحقیق و دریافت میں کوئی حصہ لیا۔ وہ اپنے موضوع کی متعدد مستند کتبِ تاریخ و آثار کو بنیاد بنا کر، اس خطۂ ارضی کی تاریخ کو مرتب کرتے ہیں۔ ان کتب میں سرجان مارشل کی موہن جوڈیرو اینڈ انڈس سویلیز، میکس مولر کی این شی انٹ سنسکرت لٹریچر اور سائنس اینڈ لینگویج، بینرجی شاستری کی اشوریا انڈیا اور پبلک ایڈمنسٹریشن ان این شی انٹ انڈیا، سرھولڈرنس کی پیپلز اینڈ پرابلمز آف انڈیا، رتی لامہتہ کی پری بدھسٹ انڈیا، جے ایل مارس کی ڈان آف ہسٹری، گرفتھ کی مترجم رامائن اور رگ وید، ایلس ورتھ کی سویلزیشن اینڈ کلایمیٹ، شام شاستری کی کتلیا ارتھ شاستر، ایڈورڈ جے تھامس کی لائف آف بدھا ایز لیجنڈ اینڈ ہسٹری، راک ھل کی لائف آف بدھا، ھیوکینیڈی کی لینڈ آف فائیو ریورز، لیوس سپنس کی متھس اینڈ لیجنڈز آف بیلونیا اینڈ اسیرا، مہر چند کی موہن جو ڈیرو، کالن ڈیوس کی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر، ای بی ھویل کی ہسٹری آف آرین رول آف انڈیا، ایلفنسٹن کی ہسٹری آف انڈیا، ونسنٹ سمتھ کی ارلی ہسٹری آف انڈیا، سٹورٹ پگٹ کی سم اینشنٹ سیٹیز آف انڈیا، راپسن کی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، میگا ستھین کی این شی انٹ انڈیا ترجمہ میک کرنڈلے، ایچ جی ویلز کی آوٹ لائن آف ہسٹری، سرہولڈچ کی گیٹس آف انڈیا، رابرٹسن کی کافرز آف ہندوکش، ھیوکینڈی کی لینڈ آف فایوریورز، پان سین کی این شی انٹ انڈیا اینڈ انڈین سویلزیشن، جی آر ہنٹر کی سکرپٹ آف ہڑپہ اینڈ موہن جوڈیرو، بیڈن پاول کی انڈین ویلیج کمیونٹی، راگوزین کی ویدک انڈیا شامل ہیں۔ ان ماخذ کے تنوع اور وسعت سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے علاقوں کی قدیم تر تاریخ، جسے مؤرخین قیامِ پاکستان سے قبل 'انڈیا' کی ذیل میں شمار کرتے اور ذکر کرتے تھے، بڑی احتیاط اور علمی مہارت سے اور ان تمام ماخذ کی مدد سے اس خطۂ ارضی کی نئی شناخت، یعنی 'مغربی پاکستان'

کی تاریخ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

ارضی تاریخ کے مؤرخ کے طور پر رشید اختر ندوی کا اسلوب اور انداز یہ ہے کہ وہ اپنے مآخذ ومصادر کے مؤلفین اور محققین کی آراء کو کثرت سے اپنے استدلال میں استعمال کرتے ہیں، جہاں ضروری ہو، وہاں اپنی رائے یا تأثر یا اختلاف کا اظہار بھی کر جاتے ہیں، لیکن چونکہ وہ ماہرِ آثاریات نہیں ہیں تو ان کا بنیادی منہج یہ ہے کہ دریافت شدہ حقائق کو ایک نئی، قدرے مختلف ترتیب کے ساتھ اور ایک علیحدہ تبصرے کے ساتھ تالیف کر دیا جائے۔ رشید اختر ندوی ارضی مؤرخ کے طور پر بیانیے کا نہایت دلچسپ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ وہ تاریخی اور ارضی حقائق و اکتشافات کو کہانی کے انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے نہایت وقیع مآخذ ومصادر کی بنیاد پر رشید اختر ندوی نے مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد اوّل میں قبل از سکندر دور کا احاطہ کیا ہے۔ یہ کتاب کل دس ابواب پر مشتمل ہے۔

مغربی پاکستان کی اس تاریخ میں قبل از سکندر دور کی جملہ تفصیلات نہایت مرتب انداز میں جمع کی گئی ہیں۔ اس خطۂ ارضی کی علاقے میں مرکزیت، بہت سارے معاملات میں اولیت اور قدامت کو مستند مآخذ کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے ساتھ جملہ مصادر کی فہرست اور اشاریہ اس کے تحقیقی انداز اور اسلوب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تاریخ متصل موضوعات پر مغربی اور مشرقی محققین کی تصانیف اور تحقیق کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے، لیکن اُردو زبان میں اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ نہایت وقیع تاریخ ہے اور یقینی طور پر رشید اختر ندوی کی تاریخ نگاری کا ایک معتبر حوالہ شمار کی جا سکتی ہے۔

ارضِ پاکستان کی تاریخ۔ پس منظر:

مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد اوّل نومبر ۱۹۶۵ء میں مرکزی اُردو بورڈ، لاہور کے زیرِ اہتمام پہلی بار شائع ہوئی، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ کتاب کے آغاز میں یہ تحریری اعلان ملتا ہے کہ:

> ''یہ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ باقی جلدیں لکھی جا چکی ہیں اور علی الترتیب چھپ رہی ہیں۔''(۸)

یہ اعلان اس اعتبار سے درست ہے کہ ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان کی تاریخ کی جلد دوم بھی مرکزی اُردو بورڈ کے زیرِ اہتمام اشاعت کے مراحل سے گزر چکی تھی۔ کتابت (ٹائپ) ہو چکی تھی۔ فائنل کاپی برائے اشاعت بھی تیار تھی کہ مرکزی اُردو بورڈ کے بورڈ آف گورنرز کے اجلاس میں مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد دوم کا مسودہ حتمی منظوری کے لیے پیش ہوا۔ چونکہ مغربی پاکستان کی تاریخ کا منصوبہ منظور ہو چکا تھا اور پہلی جلد چھپ چکی تھی، اس لیے ادارے نے دوسری جلد کے مسودے کی حتمی منظوری بورڈ آف گورنرز سے حاصل کرنے سے پہلے ہی احتیاطاً دوسری جلد ٹائپ کروا کر حتمی مسودہ، یعنی ڈمی بھی برائے اشاعت تیار کروالی تھی۔ اس ضمن میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ مرکزی اُردو بورڈ مغربی پاکستان کی تاریخ کے مکمل منصوبے کی منظوری بورڈ آف گورنرز سے حاصل کر چکا تھا اور اب یہ منصوبہ مرحلہ وار شائع ہونا شروع ہوا تھا کہ بورڈ کے ایک فاضل رکن

نے بورڈ کے اجلاس میں جلد دوم کا مسودہ طلب کر لیا۔ دونوں صورتوں میں امرِ واقعہ یہ ہے کہ اشاعت کے لیے بالکل تیار مسودہ بورڈ آف گورنرز کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ بورڈ کے ایک فاضل رکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مسودے کو ملاحظہ کرنے کے بعد مسودے کے بعض مقامات پر اعتراضات کیے اور تجویز پیش کی کہ یہ مسودہ تفصیلی مطالعے اور تجاویز کے لیے انھیں دے دیا جائے، تاکہ وہ بغور مطالعہ کر کے رپورٹ دے سکیں۔ تجویز منظور ہوئی اور مسودہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے حوالے کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد دوم کے مشمولات پر بڑی سخت رپورٹ دی اور تجویز کیا کہ مؤلف اس پر مکمل تفصیلی نظرِ ثانی کریں اور نظرِ ثانی کے بغیر اسے شائع نہ کیا جائے۔ اس رپورٹ کے بعد مرکزی اُردو بورڈ کے لیے اس کتاب کو بغیر نظرِ ثانی شائع کرنا ممکن نہ رہا۔ مصنف سے کہا گیا کہ رپورٹ کی روشنی میں مسودے پر نظرِ ثانی کر دیں، تاکہ جلد شائع ہو سکے، لیکن رشید اختر ندوی نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ انھیں دنوں رشید اختر ندوی نے گلبدن بیگم کی تالیف ہمایوں نامہ کا اُردو ترجمہ مکمل کیا تھا۔ یہ ترجمہ سنگ میل پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام اپریل ۱۹۶۶ء کو پہلی بار شائع ہوا۔ اس ترجمے کے انتساب میں رشید اختر ندوی نے مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد دوم کے لیے کیے گئے اعتراضات پر اپنے ردِ عمل کا برملا اظہار کیا۔ ہمایوں نامہ کا انتساب کچھ یوں تھا کہ:

> ''شیشے کے محل میں بیٹھ کر تنقید کرنے والے اس نام نہاد نقاد کے نام، جس نے مرکزی اُردو بورڈ لاہور کے نام میرے خلاف ایک خط لکھا اور میری کتاب تاریخ مغربی پاکستان کی غلطیاں نکالیں۔ حالانکہ ان کے اپنے خط میں جو ایک صفحے کا ہے، زبان کی تین عدد غلطیاں ہیں اور ان کی نئی کتاب تو ایک طویل غلط نامہ ہے۔'' (۹)

یاد رہے کہ مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد اوّل (۱۹۶۵ء) کی اشاعت کے ساتھ ہی، یعنی ۱۹۶۵ء میں کراچی سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تالیف لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کا پاکستانی ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ (۱۰) قیاس چاہتا ہے کہ رشید اختر ندوی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے اسے 'طویل غلط نامہ' قرار دے رہے ہیں۔ اس انتساب سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی جلد دوم کے بارے میں رپورٹ بھی رشید اختر ندوی کے ملاحظے میں آ چکی تھی۔ مرکزی اُردو بورڈ کے لیے یہ ایک مشکل صورتِ حال تھی، کیونکہ اس کی کتابت اور ڈمی کاپی تیار کروالی گئی تھی۔ گویا اخراجات ہو چکے تھے۔ اب بورڈ آف گورنرز نظرِ ثانی کروانا چاہتا ہے اور مصنف اس پر تیار نہیں۔ یہ ساری صورتِ حال اچھی خاصی اُلجھن کا باعث بن گئی۔ یہ قضیہ چل رہا تھا کہ پاکستان میں عام انتخابات ہوئے۔ یہ ۱۹۷۰ء کا قصہ ہے۔ ان انتخابات میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حنیف رامے رکن منتخب ہوئے۔ محمد حنیف رامے سے رشید اختر ندوی کے قریبی مراسم تھے۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو حنیف رامے صوبائی کابینہ میں شامل ہوئے اور ۷۳-۱۹۷۲ء تک پنجاب کے گورنر بھی رہے۔ اس کے بعد وہ ۱۵ر مارچ ۱۹۷۴ء سے لے کر ۱۵ر

جولائی ۱۹۷۵ء تک پنجاب کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ دیرینہ مراسم کی بنا پر رشید اختر ندوی حنیف رامے سے ملے اور مرکزی اُردو بورڈ سے مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد دوم کے مسودے کی واپسی کے لیے اثر و رسوخ استعمال کرنے کی گزارش کی۔ حنیف رامے مرکزی اُردو بورڈ سے ایک تعلق بھی رکھتے تھے۔ وہ یوں کہ اس ادارے سے وہ سینئر ریسرچ آفیسر کے طور پر وابستہ رہے۔ ان دنوں جسٹس ایس اے رحمٰن مرکزی اُردو بورڈ کے نگران تھے۔ ان کے زیر سایہ حنیف رامے کچھ عرصے کے لیے مرکزی اُردو بورڈ کے ایکٹنگ ڈائریکٹر بھی رہے۔ وہ بورڈ کے معاملات سے واقف اور آگاہ تھے۔ انھوں نے اس کے ڈائریکٹر اشفاق احمد سے سفارش کی کہ وہ رشید اختر ندوی کا مسئلہ حل کریں۔ رشید اختر ندوی، حنیف رامے کے کہنے پر اشفاق احمد سے ملے۔ اشفاق احمد نے ان کو مسودہ واپس کرنے کی بجائے تجویز پیش کی کہ چونکہ یہ مسودہ مرکزی اُردو بورڈ کی ملکیت ہے اور اشاعت کے لیے تیار بھی ہے۔ نظرِ ثانی کی ضرورت بورڈ آف گورنرز کی طرف سے سخت رپورٹ کی وجہ سے ہے، لہٰذا آپ کو بورڈ کے دفتر میں مناسب جگہ اور ماحول فراہم کر دیا جائے گا، تاکہ آپ مرکزی اُردو بورڈ کی حدود میں بیٹھ کر اس پر نظرِ ثانی کر لیں۔ رشید اختر ندوی اس پر آمادہ ہو گئے اور چار پانچ روز بورڈ کے دفتر آتے رہے اور رپورٹ کی روشنی میں مسودے میں تصحیح کرتے رہے۔ چند روز کے بعد انھوں نے اشفاق احمد، ڈائریکٹر مرکزی اُردو بورڈ کے سامنے مطالبہ رکھا کہ چونکہ وہ اسلام آباد میں مقیم ہیں، ان کا ذخیرۂ کتب بھی اسلام آباد میں ہے، لہٰذا انھیں یہ مسودہ اسلام آباد میں مہیا کیا جائے۔ یہ غالباً ۷۳۔۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ اشفاق احمد پر حنیف رامے کی طرف سے دباؤ بھی تھا کہ جس طرح بھی ہو، ان کا کام کیا جائے، لہٰذا اشفاق احمد نے یہ تجویز اس صورت منظور کر لی کہ مرکزی اُردو بورڈ کا ایک افسر یہ مسودہ اپنی تحویل میں لے کر اسلام آباد جائے گا اور رشید اختر ندوی کے گھر بیٹھ کر اس میں ترمیم و تصحیح کرائے گا۔ بورڈ کی طرف سے مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد دوم کے مسودے کو اسلام آباد لے جا کر ترامیم و تصحیح کرانے کی ذمہ داری محمد اکرام چغتائی کو دی گئی۔ محمد اکرم چغتائی اُن دنوں مرکزی اُردو بورڈ میں ریسرچ آفیسر تھے۔ محمد اکرام چغتائی یہ مسودہ لے کر اسلام آباد گئے اور قریباً دو ہفتے تک وہاں مقیم رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ رشید اختر ندوی اس زمانے میں اسلام آباد کے سیکٹر جی سکس فور کے ایک کشادہ گھر میں رہتے تھے۔ (۱۱)

محمد اکرام چغتائی بتاتے ہیں کہ وہ یہ مسودہ ہر روز رشید اختر ندوی کے گھر لے کر جاتے، جہاں ان کی موجودگی میں رشید اختر ندوی مسودے کی اصلاح کرتے۔ اس دوران رشید اختر ندوی ایک اچھے میزبان کی طرح اپنے مہمان کی خاطر مدارات میں بھی کوئی کمی نہ چھوڑتے۔ محمد اکرام چغتائی کے مطابق: رشید اختر ندوی ایک آسودہ حال، مہذب، وضع دار، نہایت پڑھے لکھے دانشور تھے۔ دو ہفتے مسلسل ترمیم و تصحیح کے بعد کام مکمل ہو گیا اور محمد اکرام چغتائی مسودہ لے کر واپس لاہور چلے آئے۔ اشاعت سے پہلے مسودہ پھر بورڈ آف گورنرز کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی قیادت میں بورڈ

کے دیگر اراکین نے نظرِ ثانی شدہ مسودے پر اطمینان کا اظہار نہ کیا اور قرار دیا کہ مغربی پاکستان کی تاریخ کی دوسری جلد ازسرِ نو لکھوائی جائے۔ یوں مرکزی اُردو بورڈ سے اس کتاب کی دوسری جلد کی اشاعت کو نوبت نہ آ سکی۔ رشید اختر ندوی کے لیے یہ کوئی پسندیدہ صورتِ حال نہ تھی۔ وہ کوشاں رہے کہ ان کی کتاب کا مسودہ، جس پر انھوں نے کافی محنت کی تھی، انھیں واپس مل جائے۔ بالآخر اشفاق احمد کے جانے کے بعد وہ اصل مسودہ کسی ذریعے سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس ضمن میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ رشید اختر ندوی کے مغربی پاکستان کی تاریخ کے علمی منصوبے اور اس کی جملہ تفصیلات سے مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر اشفاق احمد کو متعدد نظری اختلافات تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ منصوبے کی بقیہ جلدیں شائع ہوں۔ اس کام کے لیے انھیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، رکن بورڈ آف گورنرز کے اعتراضات ایک عذر کے طور پر میسّر آ گئے اور کتاب مکمل اور برائے اشاعت تیار ہونے کے باوجود شائع نہیں کی گئی۔ پھر یہ کتاب ارضِ پاکستان کی تاریخ کے عنوان سے ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو رشید اختر ندوی نے خود شائع کی اور جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہوئے۔ (۱۲)

مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد دوم کی اشاعت میں طویل تاخیر کی وجہ سے رشید اختر ندوی آزردہ بھی رہے۔ وہ اس تاخیر کو غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر مجاز خیال کرتے تھے۔ اس مسودے کی اشاعت کو روک کر مرکزی اُردو بورڈ نے مناسب اور ایک قومی ادارے کے شایانِ شان کام نہیں کیا تھا۔ کیا یہ صرف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اعتراضات تھے، یا مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر اشفاق احمد کے اپنے تأثرات، یا تعصبات؟ اس بارے میں حتمی رائے قائم کرنا دشوار ہے، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بیک وقت دونوں باتیں مؤثر تھیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اعتراضات اور اشفاق احمد کی پسند ناپسند۔ ایک تیسرا رُخ یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ بطور مؤرخ رشید اختر ندوی کے رجحانات کیا تھے اور کیا یہ رجحانات اُن لوگوں کے قابلِ اعتنا تھے، جنھوں نے ان کی تاریخ کو تاخیر کے اندھیروں میں غرق کرنے کی کوشش کی؟ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر مبارک علی کی ایک بحث مدد کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''.....لیکن کیا قدیم پاکستان کی تاریخ پر فخر کرنا چاہیے؟ یہاں مذہب اور نظریۂ پاکستان نے کچھ مشکلات پیدا کر دیں۔ چونکہ مذہبِ اسلام کی رو سے اسلام کی آمد سے پہلے کا تمام زمانہ جاہلیت اور تاریکی کا تھا، اس لیے اس عہد میں جو بھی تہذیب و تمدن پیدا ہوئے، وہ گمراہی اور فسق و فجور سے بھرپور تھے۔ اس لیے ان تہذیبوں اور تمدنوں کے مطالعہ اور تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ انھیں اسی حالت میں رہنے دیا جائے اور ان کے قدیم کھنڈروں اور آثار سے عبرت حاصل کی جائے۔ اس نقطۂ نظر سے تاریخ کا عمل اسلام کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے بعد کی تاریخ کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے برِصغیر کی تاریخ کی ابتداء محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے حملوں سے ہوئی۔ اس لیے اس سے پہلے کی تاریخ پر نہ تو تحقیق کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کو جاننے کی، کیونکہ یہ ہماری تاریخ

نہیں اوران کا تعلق گمراہی اور تاریکی سے ہے۔ اس وجہ سے موہن جوڈیرو اور گندھارا کی تہذیب ہماری نہیں، اس لیے ان کی شان وشوکت کو بیان کرنا مذہبی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔" (۱۳)

ڈاکٹر مبارک علی نے معاملے کی نہایت عبرت ناک تصویر کشی کی ہے۔ مغربی پاکستان کی تاریخ۔ جلد اوّل میں اس خطۂ ارضی کی قبل از سکندر دور تاریخ مرتب کی گئی تھی۔ مغربی پاکستان کی تاریخ کی دوسری جلد، جو مختلف بہانوں سے تعویق کا شکار ہوتی رہی، سکندر کی آمد اور بعد کے حالات کی تفصیل و تحقیق پر مشتمل تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس خطۂ ارضی کی اس تاریخ کو غیر ضروری سمجھا گیا۔ وجوہ ڈاکٹر مبارک علی کی بیان کردہ ہوں یا دیگر، علم و تحقیق اور فہم و فراست و دیانت کے کسی اصول پر پورا نہیں اُترتیں۔ اس حوالے سے رشید اختر ندوی کے صاحبزادے ڈاکٹر شعیب احمد مغربی پاکستان کی تاریخ جلد اوّل اور جلد دوم کے قضیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابتداء میں یہ کتاب مرکزی اُردو بورڈ لاہور کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس میں پتھر کے زمانے سے ۱۸۵۷ء تک کا طویل دور شامل ہے۔ یہ نادر روزگار کتاب، جو برِصغیر کے ایک عظیم مؤرخ کی زندگی کے چھ قیمتی سالوں، پانچ ہزار صفحات اور سات جلدوں پر مشتمل تھی، مختلف وجوہ کے باعث شائع نہ ہوسکی۔ صرف پہلی جلد شائع ہوئی اور باقی چھ جلدوں کی اشاعت روک دی گئی۔ اشاعت روکنے کی جو وجہ میری سمجھ آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے اداروں میں اپنی تاریخی حقیقتوں سے انکار اور ارضِ پاک کی تہذیب کی قدیم سچائیوں سے لاتعلقی، مروّج طرزِ عمل بن چکا ہے۔ جناب رشید اختر ندوی کی کتاب کی اشاعت روک کر اس منفی سوچ کا اظہار کیا گیا ہے۔" (۱۴)

تاریخی حقیقتوں سے انکار اور ارضِ پاک کی تہذیب کی قدیم سچائیوں سے لاتعلقی کے رویے کو وجہ خیال کرنا یوں قرینِ قیاس نظر آتا ہے کہ جلد اوّل اور جلد دوم کے مشمولات قبل از سکندر دور اور بعد از سکندر حالات و واقعات کہ جن کا تنوع اور وسعت: معاشرت، سیاست، معاش، مذہب وغیرہ سب پر محیط ہے، ممکن ہے ان سب کا ذکر بعض افراد اور اداروں کے قائم کردہ تصورات و نظریات سے پوری طرح مناسبت نہ رکھتا ہو۔ خطہ ارضِ پاکستان کی مذہبی اور روحانی مرکزیت، اولیت اور علمی فوقیت اس پورے خطے کی وحدت میں اپنی اساسی اور مرکزی حیثیت کی طرف اشارہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ اسلام کی آمد سے قبل بھی یہ خطہ ایک مذہبی اور روحانی پس منظر اور اساس رکھتا تھا اور شاید یہ امر بعض حلقوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ مرکزی اُردو بورڈ لاہور کے طرزِ عمل سے یہ کتاب ایک طویل عرصے تک شائع نہ ہوسکی۔ مرکزی اُردو بورڈ اس مسودے پر اپنی ملکیت ثابت کر کے اسے مصنف کو واپس کرنے سے گریزاں تھا۔ اس مسودے کو اشاعت کے لیے تیار کرنے کی غرض سے اخراجات بھی کر چکا تھا، لیکن کتاب کو اگر ایک ادارہ کسی بھی وجہ سے شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوتو کیا یہ مناسب نہیں کہ معقول شرائط کے ساتھ مسودہ کتاب کے مؤلف کو واپس کر دیا جائے؟ اس واپسی کے لیے رشید اختر ندوی کو ایک طویل دیوانی مقدمے سے گزرنا

پڑا۔ انھوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پاکستان میں یہ دروازہ کھل تو جاتا ہے، لیکن اُن کے لیے جو نہایت صبر اور ثابت قدمی سے طویل انتظار کے امتحان میں کامیاب ہونے کا عمل مظاہرہ کرسکیں۔ رشید اختر ندوی کو، چونکہ اپنی محنت کا ضائع ہونا گوارا نہیں تھا، اس لیے انھوں نے نہایت ثابت قدمی سے مقدمہ لڑا۔ ڈاکٹر شعیب احمد لکھتے ہیں:

> ''ندوی صاحب نے ایک طویل مقدمے کے بعد، تقریباً بیس برس کا عرصہ گزر جانے پر، اسی کتاب کو اپنے طور پر چھپوانے کے حقوق مرکزی اُردو بورڈ سے حاصل کیے اور یوں یہ عظیم تحریر مرکزی اُردو بورڈ کے سرد خانے سے نکلوائی، جس میں ارضِ پاک کی تاریخ کے سات ہزار سال زندہ ہیں۔'' (۱۵)

ارضِ پاکستان کی تاریخ ، جلد دوم:

یہ وہ پس منظر ہے جس کی وجہ سے مغربی پاکستان کی تاریخ کی جلد دوم، جسے ۱۹۶۵ء، یا ۱۹۶۶ء میں مرکزی اُردو بورڈ لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہونا تھا، بالآخر ۲۰ر مارچ ۱۹۸۷ء میں رشید اختر ندوی نے خود شائع کی، لیکن ۱۹۸۷ء میں پاکستان نہ مشرقی رہا تھا نہ مغربی، صرف پاکستان تھا۔ اسی لیے رشید اختر ندوی نے 'مغربی پاکستان' کو 'ارضِ پاکستان' میں تبدیل کرلیا اور مغربی پاکستان کی تاریخ جلد اوّل کو جلد دوم کے مسودے کے ساتھ ملا کر ارضِ پاکستان کی تاریخ کے زیرِ عنوان شائع کیا۔ یہی کتاب اسی عنوان سے بعدازاں سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۸ء میں شائع کی۔

ارضِ پاکستان کی تاریخ جلد دوم کے حرفِ آغاز میں رشید اختر ندوی اس کتاب کے اشاعت کے جواز اور وجوہ پر، اپنے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آپ اس کا پہلا حصہ پڑھ چکے ہیں، جسے میں نے اس حصہ کی طرح پہلی بار چھاپا ہے۔ دراصل کتابیں چھاپنے کا کام مصنف کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو مصنف اپنی کتابیں خود چھاپتے ہیں، وہ انھیں خود بیچ نہیں سکتے۔ انھیں بہرحال ان اداروں کے ذریعہ اپنی چھاپی ہوئی کتاب بازار میں لانا پڑتی ہے، جو کتابیں بیچتے اور انھیں عوام تک پہنچاتے ہیں۔ میں نے یہ کتاب اپنی خوشی سے نہیں چھاپی۔ مجھے اسے بعض ایسی وجوہ کے سبب چھاپنا پڑا، جن کا اظہار نہ موزوں ہے اور نہ مناسب۔ البتہ میں یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری یہ کتاب ایک ادارہ کے ہاں کئی سال سے مطبوعہ شکل میں پڑی تھی، مگر اس ادارہ نے محض ذاتی اختلافات کی بنا پر اسے شائع نہیں کیا۔ آپ کو ہم مصنفین کے گروہ کے بارے میں شاید یہ بات معلوم ہو، یا نہ ہو کہ ہماری مالی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ ہم اپنی کتابیں چھاپنے کا بوجھ اُٹھا سکیں۔ یوں بھی کتابیں لکھنا الگ فن ہے اور کتابیں چھاپنا اور انھیں بیچنا بالکل جداگانہ فن ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر کوئی اسی ہزار روپے صرف آئے ہیں اور تین سال تک متواتر میں نے اس کی خاطر ڈبل روٹی، پنیر اور دودھ پر گزر کیا ہے کہ کہیں سخت خوراک کھانے سے بیمار نہ پڑ جاؤں اور یہ کام ادھورا نہ رہ جائے۔ بحمد اللہ میں اس دوران نہ

بیمار رہوا اور نہ میرا ذہن اور میرا قلم اس کام سے اُکتایا۔" (۱۶)

اس تاریخ کی تالیف پر کی گئی محنت کا برملا ذکر کرتے ہوئے کتاب کے حرفِ آغاز میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"بہر حال یہ کتاب آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے۔ آپ خود اندازہ فرمائیں گے کہ یہ کتاب کس محنت سے لکھی گئی ہے۔ میں اگر آپ سے یہ کہوں تو آپ یقین فرمالیں کہ میں نے اس کتاب کے لکھنے کے لیے تین بار انگلستان کا سفر کیا۔ انڈیا آفس لائبریری سے ضروری مواد جمع کیا۔ پھر نیو یارک کی کولمبیا یونیورسٹی تک رسائی پائی"۔

اسی تسلسل میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"مجھے دعویٰ تو نہیں ہے کہ ایسی کتابیں بڑی مشکل سے لکھی جاتی ہیں اور انھیں لکھتے لکھتے آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی اسے جوانی میں شروع کیا تھا اور اسے چھاپتے وقت بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکا ہوں اور توانائیاں ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔ اس کے باوجود میں پچھلے سال، اس کتاب کی تکمیل کے لیے نیو یارک پہنچا اور کولمبیا یونیورسٹی کے تاریخی شعبہ سے کافی استفادہ کیا۔" (۱۷)

رشید اختر ندوی کی یہ محنت اور ضروری مآخذ کی تلاش میں انگلستان اور امریکہ کے سفر کی مشقت دراصل اس پورے تحقیقی منصوبے پر حاوی ہے۔ مغربی پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے مآخذ کی طویل فہرست، جو جلد اوّل کے حوالے سے ذکر ہوئی، جلد دوم کے بھی مآخذ کم و بیش وہی ہیں۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ جلد اوّل اور جلد دوم ایک ساتھ ہی مکمل ہوئیں؛ ٹائپ ہوئیں اور یکے بعد دیگرے شائع ہونے والی تھیں۔ صرف ایک جلد کی اشاعت کے بعد، تاریخ نویسی کے اس رجحان سے اختلاف رکھتے ہوئے، جس کا اظہار اپنی تالیف میں رشید اختر ندوی نے کیا، مرکزی اُردو بورڈ کے نئے ڈائریکٹر اشفاق احمد اور رکن بورڈ آف گورنرز ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے عدم اتفاق کے باعث دوسری جلد کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ یہاں جلد دوم کی تالیف کے لیے جس مشقت اور علمی محنت کا ذکر فاضل مؤلف کر رہے ہیں، وہ مجموعی طور پر اس پورے تصنیفی منصوبے کے حوالے سے کی گئی محنت خیال کی جانی چاہیے۔

ارضِ پاکستان کی تاریخ ۔ جلد دوم، تیرہ ابواب اور ہر باب کی موضوع کی مناسبت سے، متعدد فصول پر مشتمل ہے۔

ارضِ پاکستان کی تاریخ ۔ جلد دوم کے موضوعات اور مشمولات ارضِ پاکستان کی قدیم ترین اور قبل از اسلام تاریخ پر، جس طرح روشنی ڈال رہی ہے، اُردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصی منفرد معلوم ہوتی ہے۔ ارضِ پاکستان کی تاریخ کی جلد دوم ۱۹۶۵ء کی بجائے بوجوہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہو سکی۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ اگر امرِ واقعہ کا نام ہے تو اسے زیادہ دیر مستور نہیں رکھا جا سکتا۔ تاریخ کو اپنی حکمتِ عملی، پسند ناپسند اور مفادات کے تابع رکھنے کا عمل اپنے نتائج کے اعتبار سے بے سود ثابت ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان اس قدیم ترین خطے کی تاریخ کا ایک نسبتاً نیا

واقعہ ہے، لیکن جس طرح قیامِ پاکستان اس خطۂ ارض کی توقیر میں اضافے اور تاریخی تجربے میں توسیع کا باعث بنا ہے، اسی طرح اس خطۂ ارضی کی قدیم تاریخ کی دریافت اور بازیافت نے ملک پاکستان کی توقیر اور اعتبار میں اضافہ کیا ہے۔ تاریخ کو اگر خوف نہ بنایا جائے تو افراد و اقوام کی نفسیاتی طاقت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

حوالے:

۱۔ موجِ کوثر: شیخ محمد اکرام: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور: بائیسواں ایڈیشن ۲۰۰۳ء: ص ۱۹۰ و ۱۹۱۔

۲۔ محولہ بالا: ص ۱۹۱۔

۳۔ تاریخ کے بدلتے نظریات: ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۲ء: ص ۱۳۸۔

۴۔ مغربی پاکستان کی تاریخ، جلد اوّل، رشید اختر ندوی: مرکزی اُردو بورڈ بار اوّل، لاہور: نومبر ۱۹۶۵ء: ص ا۔

۵۔ محولہ بالا: ص ۳۔

۶۔ محولہ بالا: ص ۱۲۔

۷۔ محولہ بالا: ص ۱۲۔

۸۔ محولہ بالا: ص ۲۔

۹۔ انتساب، ہمایوں نامہ: رشید اختر ندوی (مترجم): سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: بار اوّل ۱۹۶۶ء۔

۱۰۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی: غضنفر اکیڈمی، کراچی: طبعِ ثانی ۱۹۸۷ء۔

۱۱۔ گھر کا مکمل پتا یہ تھا: مکان نمبر ۲۲ / ۵ ایف سیکٹر جی سکس فور، اسلام آباد۔

۱۲۔ رشید اختر ندوی۔ شخصیت اور فن: زاہد نوید: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد: اشاعتِ اوّل جون ۱۹۹۹ء: ص ۱۰۲۔

۱۳۔ تاریخ کے بدلتے نظریات: ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۲ء: ص ۱۳۶، ۱۴۵۔

۱۴۔ پس منظر از ڈاکٹر شعیب احمد مشمولہ پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان: رشید اختر ندوی: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد: طبعِ اوّل ۱۹۹۵ء۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ارضِ پاکستان کی تاریخ، جلد دوم: رشید اختر ندوی: ص ۳۰۴۔

۱۷۔ ایضاً۔

عبدالستار ملک
لیکچرار شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

انڈیکس

تعبیر: شمارہ ۱: جنوری تا جون ۲۰۱۵ء

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	خلاصہ	کلیدی الفاظ
ابرار عبدالسلام	مومن خان مومن کے حالات میں پہلا مضمون	۷ تا ۲۰	اس مضمون میں مقالہ نگار نے مومن کے حالاتِ زندگی پر شائع ہونے والے پہلے مضمون کی دریافت کی اور اسے تدوین وتہذیب کے ساتھ متعارف کرایا ۔ یہ مضمون اودھ اخبار لکھنؤ میں ۲؍ مارچ ۱۸۸۱ء کو شائع ہوا۔ اس سے قبل یہ مضمون علی الترتیب سفیرِ ہند امرتسر اور پنجابی اخبار لاہور میں چھپ چکا تھا۔ مقالہ نگار نے آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن کے حالاتِ زندگی شامل نہ ہونے کے ضمن میں مولانا آزاد کے عذر کو بلاجواز قرار دیا ہے۔	مومن خان مومن، سوانح، اودھ اخبار لکھنؤ، آبِ حیات
محمد افتخار شفیع	الطاف حسین حالی کے ایک نادر اور غیر مطبوعہ مضمون کا مکمل متن مع حواشی	۲۱ تا ۳۶	مقالہ نگار نے اشرف قدسی کے نجی کتب خانے سے مولانا حالی کے ایک نثری مضمون شواہد الالہام کی دریافت کی۔ یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ (الف) الہام اور وحی کی ضرورت۔ عقلی دلائل (ب) نبی کی ضرورت۔ ایک وجدانی شہادت حالی نے عقلی دلائل اور شواہد سے اپنے موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی۔	الطاف حسین حالی، غیر مطبوعہ مضمون، شواہد الالہام

شفیق انجم	مثنوی یوسف زلیخا اور مرزاقطب علی بیگ فگار	۳۷ تا ۴۲	مضمون نگار کو مطبع مجتبائی لکھنؤ سے طبع شدہ ایک متن زلیخا اردو کے نام سے فراہم ہوا۔ تحقیق و جستجو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مثنوی یوسف زلیخا مرزاقطب علی بیگ فگار دہلوی معاصر میر حسن کی ہے۔	مرزاقطب علی بیگ فگار، مثنوی یوسف زلیخا، عشق نامہ
محمد توقیر احمد	رشید حسن خاں کے تدوینی امتیازات	۴۳ تا ۶۶	زیر نظر مقالہ گلزار نسیم، سحرالبیان اور مثنویاتِ شوق کی تدوین کے ضمن میں رشید حسن خاں کے تدوینی امتیازات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ تدوینِ متن سے متعلق جملہ مباحث بھی شامل ہیں۔	رشید حسن خاں، تاریخ متن، تحدید متن، تصحیح و ترتیبِ متن، مقدماتِ متن
عامر رشید	دیوان زادہ: نسخۂ ذوالفقار اور نسخۂ عبدالحق کے اختلافاتِ نسخ کا مختصر تنقیدی جائزہ	۶۷ تا ۸۸	دیوان زادہ حاتم کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس مقالے میں بیسویں صدی کے دو معروف محققین ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر عبدالحق کے مدون کردہ نسخوں کے اختلافات کا عمیق نگاہی سے جائزہ لیا گیا ہے۔	دیوان زادہ ۔۔ نسخۂ عبدالحق، نسخۂ ذوالفقار

رؤف پاریکھ	اردو لغت نویسی اور اردو کی چند نادر اور کمیاب خصوصی لغات	۸۹ تا ۹۶	یہ مقالہ اردو کی خصوصی لغات فرہنگِ عثمانیہ از ابوالمعارف میر لطف علی عارف ابوالعلائی (دفتری اصطلاحات صفحات ۳۱۸) لغاتِ نادرہ مؤلفہ نادر حسین بلگرامی (خاص الفاظ جن کے ابتدائی حروف میں حرکات بدل جانے سے معانی بدل جاتے ہیں، صفحات ۸۴) دکن کی زبان مؤلفہ میر لطف علی عارف ابوالعلائی (صفحات ۸۴)، دکنی لغت مؤلفہ شعار ہاشمی (جیبی سائز، صفحات ۱۲۷) اور مطالبِ غرا مؤلفہ محمد نصیر الدین نقش (ذومعنین الفاظ، صفحات ۵۰) کے تعارفی مطالعے پر مشتمل ہے۔	رؤف پاریکھ، فرہنگِ عثمانیہ، لغاتِ نادرہ، دکنی لغت، مطالبِ غرا
ظفر احمد	اردو میں لسانی تحقیق۔ ایک تجزیاتی مطالعہ (۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک)	۹۷ تا ۱۰۴	یہ مقالہ اردو میں لسانی تحقیق کے ایک معتد بہ حصہ کو محیط ہے، جس میں انگریز اور مشرقی محققین کی چند اہم لسانی تحقیقات کا ذکر ہے۔	اردو میں لسانی تحقیق، انسائیکلوپیڈیا آف انڈو آرین فلولوجی، جدید ہند آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ، لسانیاتی جائزہ ہند
طارق حبیب	میراجی شناسی اور ڈاکٹر محمد صادق (تحقیق، ترجمہ اور تنقید)	۱۲۵ تا ۱۳۶	زیرِ نظر مضمون تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں میراجی کے مختصر سوانحی حالات، دوسرے میں ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب Twentieth century of Urdu Licturer میں میراجی سے متعلق انگریزی صفحات کا ترجمہ، جبکہ تیسرے میں ڈاکٹر محمد صادق کی تنقید پر مقالہ نگار کی رائے کا اظہار ہے۔	میراجی شناسی، ڈاکٹر محمد صادق، Twentieth century of urdu Literature

عمران عراقی	دیویندر اسر کا افسانوی اختصاص	۱۳۷ تا ۱۴۲	دیویندر اسر بیک وقت اردو، ہندی، انگریزی اور پنجابی میں لکھنے والے ادیب ہیں۔ افسانہ نگار، ناول نگار اور نقاد ان کی مختلف جہات ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں ان کی افسانہ نگاری پر ناقدانہ تبصرہ ہے۔	دیویندر اسر، گیت اور انگارے، شیشوں کا مسیحا، کینوس کا صحرا، پرندے اب کیوں نہیں اڑتے
حسن نواز شاہ	مولانا فقیر محمد جہلمی کے غیر مطبوعہ مکتوبات	۱۰۵ تا ۱۱۴	یہ مقالہ معروف عالمِ دین مولانا فقیر محمد جہلمی کے بیس مکتوبات پر مشتمل ہے، جو مولانا حکیم غلام محی الدین قریشی دیالوی کے نام ہیں۔ یہ مکتوبات زیادہ تر سراج الاخبار سے متعلق ہیں، جو مکتوبات نگار کی ملکیت تھا، تاہم چند خطوط میں اس عہد کی علمی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ ہے۔	مولانا فقیر محمد جہلمی، مولانا حکیم غلام محی الدین قریشی، سراج االاخبار
نعیم انیس	مغربی بنگال میں ارد کا ایک اہم مرکز۔ مرشد آباد	۱۱۵ تا ۱۲۴	مغربی بنگال میں دبستانِ مرشد آباد کی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ نثر کی نسبت شعری ماحول یہاں زیادہ سازگار رہا۔ مضمون نگار نے تاریخی پس منظر کے ساتھ عہدِ موجود کے شعراء کے احوال وفن کو جگر کاوی سے پیش کیا ہے۔	مرشد آباد، ڈاکٹر نعیم انیس، مغربی بنگال

ظفر حسین ظفر	رشید حسن خاں کے خطوط۔ جلد دوم	۱۴۳ تا ۱۵۰	زیرِ نظر مقالہ میں خطوط سے ایسے اقتباسات دیے گئے ہیں، جو رشید حسن خاں کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہیں، نیز تدوینِ متن اور زبان واملا کی تفہیم کے لیے بھی بصیرت افروز ہیں۔	رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، ڈاکٹر ٹی آر رینا
ارشد محمود ناشاد	تاریخِ ادبیاتِ اردو	۱۵۱ تا ۱۵۶	یہ مقالہ محسنِ اردو مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی کی علمی خدمات اور تصانیف کا مختصر، مگر جامع تعارف ہے۔ گارسین دتاسی پر کیے گئے تحقیقی کام کے ساتھ ان کے خطبات، مقالات کے تراجم، خصوصیت سے تاریخِ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی پر بصیرت افروز معلومات فراہم کی گئی ہیں۔	تاریخِ ادبیاتِ اردو، گارسین دتاسی، لیلیان سیکتن نازرو
محمد شیراز	اردو ڈسکورس مارکر کی ہیئت اور افعال	۵ تا ۱۴	یہ مقالہ اردو ڈسکورس مارکر (حروف سزاوجزا اور حروفِ عطف وغیرہ) کی مختلف اقسام اور جہات کی نشاندہی کی ایک کاوش ہے، جو اردو لسانیات کے قاری کے لیے مزید تجسس کا سامان فراہم کرتا ہے۔	اردو ڈسکورس مارکر، محمد شیراز

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	خلاصہ	کلیدی الفاظ
محمد سفیر اعوان اور محمد اجمل خان	ہیسے کے سدھارتھ کا بین المتنی تجزیہ	۱۵ تا ۴۵	اس مقالے میں ہرمن ہیسے کے ناول سدھارتھ کے انگریزی ترجمے کا بین المتنی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تجزیے میں ناول کی مختلف جہات کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت سے مابعد الطبیعیاتی پہلو کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔	ہیسے، بین المتنی تجزیہ، سدھارتھ

تعبیر: شمارہ ۲: جولائی تا دسمبر ۲۰۱۵ء

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	خلاصہ	کلیدی الفاظ
ابرار عبدالسلام	مومن خان مومن اور محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات کے تناظر میں	۷ تا ۲۶	اس مقالے میں ان اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے، جن کی بنا پر آزاد نے آبِ حیات میں مومن خان مومن کو پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا اور دوسرے ایڈیشن میں بھی درست تصویر کشی نہیں کی۔	مومن خان مومن، محمد حسین آزاد، آبِ حیات، کلب علی فائق، ڈاکٹر محمد صادق
محمد توقیر احمد	دیوانِ غمگین اور مخزن الاسرار	۲۷ تا ۶۲	پیشِ نظر مقالے میں دیوانِ غمگین کا دستیاب شواہد کی روشنی میں تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ دیوان سید علی محمد غمگین دہلوی کا ہے۔ دیوانِ غمگین اور مخزن الاسرار دونوں نسخوں میں اختلافات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔	دیوانِ غمگین، مرزا محمد محسن برلاس، مخزن الاسرار، نسیم حضرت جی

حمیداللہ خٹک	اردو اور افغان۔تعارف، حواشی اور تعلیقات	٦٧ تا ١٠٤	اس مضمون میں اردو کے صفِ اوّل کے محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی معرکہ آرا تصنیف اردو اور افغان سے متعلق ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب درحقیقت مولانا عرشی کا تحقیقی مقالہ ہے، جو ترمیم و اضافہ کے ساتھ مختلف جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ مضمون نگار نے مولانا عرشی کے بعض پشتو زبان کے لغات پر مفید حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا ہے۔	اردو اور افغان، اردو میں پشتو کا حصہ، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، حمیداللہ خٹک
رؤف پاریکھ	علمِ لغت، لغوی معنیات اور لغت نویسی	١٠٥ تا ١١٤	یہ مضمون علمِ لغت، لغوی معنیات اور لغت نویسی کی تفہیم وتشریح پر مشتمل ہے۔ محقق نے انگریزی کی متعدد جدید کتب سے استفادہ کرتے ہوئے ان دقیق اصطلاحات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔	علمِ لغت، لغوی معنیات اور لغت نویسی، رؤف پاریکھ
گلباز	فرہنگ نویسی کے آغاز وارتقاء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو کا کردار	١١٥ تا ١٢٤	مقالہ نگار نے سندھ یونیورسٹی جامشورو میں سندی تحقیق کے لیے مرتب ہونے والے مختلف ادبی متون کی فرہنگوں کا جائزہ پیش کیا ہے، جو اس پہلو پر ایک اہم دستاویزی اضافہ ہے۔	فرہنگ نویسی، سندھ یونیورسٹی جامشورو، گلباز
شفیق انجم	مخزن کے مقاصد اور شیخ عبدالقادر۔ ایک نئی خواندگی	١٢٥ تا ١٣٨	اس مقالے میں معروف ادبی مجلّے مخزن کے پہلے پانچ شماروں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اداریوں کی روشنی میں مجلّے کے مقاصد کا تجزیہ کیا گیا ہے اور مخزن کی نئی معنویت دریافت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔	مخزن، شیخ عبدالقادر، شفیق انجم
رحمت علی شاد	قرۃ العین کا شعری شعور	١٣٩ تا ١٤٩	اس مقالے میں اردو کی ناول نگار قرۃ العین حیدر کے اسلوبِ تحریر کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے شعری شعور کو دریافت کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے قرۃ العین حیدر کے شعری ذوق، تخیل اور تحریر میں شعری آہنگ کو متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔	رحمت علی شاد، قرۃ العین حیدر، شعری شعور

محمد شیراز	Briuging Lexicography Theory and Pedagogicall Practices . A Critical Study of Oxford Urdu.English Dictionay	۵ تا ۱۰	اس آرٹیکل میں اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت کا دوسری انگریزی اردو ۔انگریزی لغات کے ساتھ تقابل کیا گیا ہے۔ مضمون میں اندراج کے متعدد ایسے گوشوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو دوسری لغات میں نظر انداز ہو گئے تھے۔ مقالہ نگار کے تجزیے کے مطابق مذکورہ لغت طلبہ کے لیے زیادہ مفید ہے۔	muhammad Sheeraz, Oxford Urdu.English Dictionary, Rauf Parekh
شمائلہ حلیم	Language Appropriation in Ahmad Ali's Twelight in Delhi		اس مقالے میں زبان کے تصرف کی روشنی میں احمد علی کے ناول Twelight in Delhi کا تجزیہ کیا گیا ہے اور پس استعماریت کے مسائل کی نمائندگی، مزاحمت، شناخت، کلچر اور زبان کو موضوع بنایا گیا ہے۔	Post Colonialism, , Native Language, Ahmad Ali,Twelight in Delhi

تعبیر: شمارہ۳ (مکتوبات نمبر): جنوری تا جون ۲۰۱۶ء

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	خلاصہ	کلیدی الفاظ
حسن نواز شاہ	علامہ محمد اقبال ایک نو دریافت خط	۷ تا ۱۲	اس مضمون میں محمد اسلم علاقہ دار کے نام علامہ اقبال کے ایک خط کا ذکر ہے ۔متعدد حوالوں اور تفصیلات کے ذریعے مکتوب الیہ سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔	علامہ محمد اقبال، نو دریافت خط، محمد اسلم خان علاقہ دار

طارق الیاس	علامہ اقبال کے حوالے سے ایک نادر مکتوب کی بازیافت	۱۳ تا ۲۲	پیشِ نظر مضمون میں مقالہ نگار نے ایک انتہائی اہم اور نادر خط کی دریافت کی ہے، جو علامہ اقبال کے سفرِ اندلس سے متعلق ہے۔ یہ خط وزیرِ تعلیم فرنانڈو دے لوس ریوس نے پروفیسر آسن کے نام تحریر کیا ہے۔ اس اہم مکتوب سے علامہ اقبال کی سیاحتِ ہسپانیہ کے کئی گوشے وا ہوتے ہیں۔	نادر مکتوب، طارق الیاس، فرنانڈو دے لوس ریوس، میگیل آسن پلاسیوس
سفیر اختر	مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے چار پوسٹ کارڈ	۲۳ تا ۳۲	زیرِ نظر مضمون مقالہ نگار کے نام مولانا امتیاز علی عرشی کے چار پوسٹ کارڈ (خطوط) پر مشتمل ہے، جن میں مقالہ نگار کی متعدد ادبی اور علمی مسائل میں رہنمائی کی گئی ہے۔ مفید حواشی نے متن کی تفہیم کو آسان بنادیا ہے۔	مولانا امتیاز علی خاں عرشی، سفیر اختر
ظفر حسین ظفر	سید ابوالاعلیٰ مودودی کے چند غیر مطبوعہ مکاتیب	۳۳ تا ۶۴	اس مضمون میں پروفیسر خورشید احمد کے نام مولانا مودودی کے ۲۵ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔ چونکہ پروفیسر خورشید احمد جماعتِ اسلامی کی اہم شخصیت ہیں اور ان کے ساتھ مولانا کا گہرا رشتہ تھا، اس لیے ان خطوط کے مندرجات بہت اہم ہیں۔ مختلف امور میں مکتوب الیہ رہنمائی کی گئی ہے۔ حواشی و تعلیقات کے اضافے نے متن کی تفہیم میں آسانی پیدا کر دی ہے۔	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر خورشید احمد، جماعتِ اسلامی، غیر مطبوعہ خطوط

مشتاق احمد ساقی	مولانا ابوالکلام آزاد کے پانچ خطوط	۶۵ تا ۷۶	زیرِ نظر مقالے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ پانچ خطوط شامل ہیں، جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کے نام لکھے۔ ان خطوط میں بعض دینی امور پر بہت اہم گفتگو کی گئی ہے۔ معارف میں شائع ہونے والے مضامین اور دارالمصنفین کی کتابوں پر نقد و تبصرہ ہے۔ حواشی کے اضافے نے تفہیم کو سہل بنا دیا ہے۔	ابوالکلام آزاد، معارف، دارالمصنفین، مشتاق احمد ساقی، سید سلیمان ندوی
عظمت حیات	ڈاکٹر سید محمود الرحمٰن کے نام مشاہیر خطوط	۷۷ تا ۱۷۲	پیشِ نظر مقالے میں جن میں ابن انشاء، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، حامد اللہ افسر، رئیس امروہوی، تمنا عمادی، شاہد احمد دہلوی، شفیع الدین نیرؔ، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قدرت اللہ شہاب، وزیر آغا، مرزا ادیب اور ہاجرہ مسرور جیسے نامور شعراء، ادباء اور محققین وناقدین کے ۹۰ خطوط شامل ہیں۔ حواشی و تعلیقات نے ان مکاتیب کی تہذیب و تحسین اور تفہیم و تسہیل کو آسان تر کر دیا ہے۔	عظمت حیات، ڈاکٹر سید محمود الرحمٰن، مشاہیر خطوط

اعجاز نقی	ڈاکٹر سید عبداللہ کے خطوط	۱۷۳ تا ۱۷۸	یہ خطوط اقبالیات کے معروف استاد اور محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام ہیں۔ ان خطوط میں انجمن ترقیِ اردو لاہور کے زیرِ اہتمام اقبال اور اقبالیات کے موضوع پر ہونے والے سیمیناروں کا ذکر ہے۔ ان خطوط کی اہمیت اس بنا پر بھی دوچند ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں اعلیٰ درجے کے معلم اور محقق ہیں۔	ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، انجمن ترقی اردو، لاہور
محمد توقیر احمد	جمیل آذر کے نام چند خطوط	۱۷۹ تا ۱۹۶	اس مضمون میں معروف نقاد اور انشائیہ نگار جمیل آذر کے نام تین شخصیات کے انیس خطوط کو شامل کیا گیا ہے، جن میں سے ایک خط ممتاز مفتی کا، بارہ شہزاد منظر کے اور چھے خطوط غلام الثقلین نقوی کے ہیں۔ تینوں مکتوب نگار فکشن رائٹر ہیں۔ حواشی وتعلیقات کے اضافے نے ان مکاتیب کی پیشکش میں نکھار پیدا کیا ہے۔	جمیل آذر کے نام خطوط، محمد توقیر احمد، ممتاز مفتی، شہزاد منظر، غلام الثقلین نقوی
فیصل ریحان	صاحبزادہ حمیداللہ کے تین خط	۱۹۷ تا ۲۰۱	اس مضمون میں صاحبزادہ حمیداللہ کے تین خطوط کی حواشی سے تزئین کی گئی ہے۔ تینوں خطوط ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے نام ہیں۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں بلوچستان کی نہایت معروف علمی و ادبی شخصیات ہیں۔ یہ خطوط مکتوب نگار کے سوانحی گوشوں کو اجاگر کرنے میں معاون ہیں۔	صاحبزادہ حمیداللہ، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، فیصل ریحان، تذکرہ صوفیائے بلوچستان، پشتو میں سیرت نگاری

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	خلاصہ	کلیدی الفاظ
ابرار عبدالسلام	آزاد کی حمایت میں	۷ تا ۴۶	اس مضمون میں آزاد کی تنقیص و تحقیر کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے آزاد پر بے جا نکتہ چینی کی مدلل انداز میں تردید کی ہے۔ مضمون میں خصوصیت سے آبِ حیات اور دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد پر اعتراضات والزامات کے جواب دیے گئے ہیں جو محض غلط فہمی اور عدم معلومات کی بنا پر کیے گئے۔	آزاد کی حمایت میں ، ابرار عبدالسلام ، دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد
طارق علی شہزاد	نوازش لکھنوی۔ عہد سوانح اور کلام	۴۷ تا ۱۲۰	مقالہ نگار نے نوازش لکھنوی کی سوانح کے ساتھ ان کے عہد اور معاصرین کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے کلام کا جامع تجزیہ کرتے ہوئے متعدد مثالیں پیش کی ہیں ،جن سے اس عہد اور نوازش لکھنوی کے شعری مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔	نوازش لکھنوی ،عہد،سوانح اور کلام،میر سوز
حمید اللہ خٹک	کچھ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بارے میں	۱۲۱ تا ۱۲۸	مضمون نگار نے اردو کے صفِ اول کے محقق اور مدون مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بارے میں مستند، نادر اور کمیاب معلومات فراہم کرنے کی سعی کی ہے۔ مولانا عرشی کا شادی کارڈ اور ان کے فرزند ڈاکٹر نجف عرشی کا جواب نامہ خاصے کی چیزیں ہیں۔	امتیاز علی عرشی، حمید اللہ خٹک، نجف کو بھیجا گیا سوالنامہ

سہیل عباس	نورافشاں ـ ایک قدیم اردو اخبار	۱۲۹ تا ۱۴۰	مضمون نگار نے ایک قدیم ہفت روزہ اردو اخبار "نورافشاں" کا تعارف کرایا ہے، جس کی اشاعت کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ یہ اخبار مارچ ۱۸۷۲ء سے دسمبر ۱۹۴۴ء تک شائع ہوتا رہا۔ مضمون نگار نے دستیاب شماروں کی تعداد ۳۰۳۵ بتائی ہے۔ اس اخبار کا مطالعہ انیسویں صدی کی صحافت اور نو آبادیت کی تفہیم میں معاون ہو سکتا ہے۔	نورافشاں، ایک قدیم اردو اخبار، سہیل عباس، منشی اشرف علی اشرف
محمد شعیب	اشرف صبوحی کے "میر ٹوٹرو" اور آسکر وائلڈ کے The Devoted Friend میں حیرت انگیز مماثلت ـ ایک تقابلی مطالعہ	۱۴۱ تا ۱۵۲	مقالہ نگار نے اشرف صبوحی کے خاکے میر ٹوٹرو اور آسکر وائلڈ کی کہانی The Devoted Friend کا دقتِ نظر سے تقابلی جائزہ لیا ہے اور متن کے مماثلات اور مشابہات کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مقالہ نگار کے نزدیک اشرف صبوحی کا خاکہ آسکر وائلڈ کی کہانی کا چربہ ہے۔	اشرف صبوحی، میر ٹوٹرو، آسکر وائلڈ، The Devoted Friend

رفاقت علی شاہد	اردو لغت نویسی میں رؤف پاریکھ کی چند خدمات	۱۵۳ تا ۱۶۴	پیشِ نظر مضمون میں اردو لغت شناسی کے میدان میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے اور ان کی تصانیف اور مقالوں کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے، جو اس میدان کے طالب علم کے لیے ایک مفید دستاویز ہے۔	رفاقت علی شاہد، رؤف پاریکھ، اردو لغت شناسی، اردو انگریزی ڈکشنری، اولین اردو سلینگ لغت
نورینہ تحریم بابر	اردو میں ارضِ پاکستان کی تاریخ نگاری۔ ایک توضیحی مطالعہ	۱۶۵ تا ۱۷۶	یہ مقالہ رشید اختر ندوی کی تصنیف ارضِ پاکستان کی تاریخ پر جامع تبصرہ ہے، جو قبل از سکندر دور اور بعد از سکندر حالات واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مضمون سے گراں قدر تصنیف کے متعدد گوشے وا کرنے کے ساتھ مذکورہ تصنیف کے تکمیلی اور اشاعتی مراحل کی روداد بھی ہے۔	نورینہ تحریم بابر، ارضِ پاکستان کی تاریخ، رشید اختر ندوی

Ta'beer

Research Journal
of
Urdu Language & Literature

Issue: 4

July - December, 2016

Editor
Abdul Aziz Sahir

Department of Urdu
Allama Iqbal Open University, Islamabad

Ta'beer

Research Journal
of
Urdu Language & Literature

Issue: 4

July - December, 2016

Department of Urdu
Allama Iqbal Open University, Islamabad